الرسالہ

سرپرست
مولانا وحید الدین خاں

کوئی شخص یہ نادانی نہیں کرے گا کہ اپنے گھر کا کھانا کاٹھ کی ہنڈیا میں پکائے۔ کیونکہ ہر شخص جانتا ہے کہ چولھے کی آگ کاٹھ کی ہنڈیا کو جلا دے گی۔ اور بالآخر آدمی کے حصے میں کچھ نہیں آئے گا۔ مگر کیسی عجیب بات ہے کہ ملت کا کھانا ہر آدمی کاٹھ کی ہنڈیا میں پکا رہا ہے۔ نعرے اور پوسٹر، جلسے اور کانفرنسیں، شاعری اور خطابت، احتجاج اور مطالبات، یہ سب "کاٹھ کی ہنڈیا" ہیں۔ مگر ہمارے تمام قائدین انھیں کے ذریعہ ملت کا مستقبل تعمیر کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ پچھلی کئی نسلوں کے ناکام تجربات بھی ان کے جوش میں کمی کا باعث نہ ہو سکے۔

شمارہ ۱۸ زر تعاون سالانہ ۲۴ روپے قیمت فی پرچہ
خصوصی تعاون سالانہ ایک سو روپے
مئی ۱۹۷۸ بیرونی ممالک سے ۱۵ ڈالر امریکی دو روپے

الرسالہ

شمارہ ۱۸ مئی ۱۹۷۸

جمعیۃ بلڈنگ • قاسم جان اسٹریٹ • دہلی ۶

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عن الزبیر عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: دب الیکم داء الامم قبلکم الحسد والبغضاء

ابن عبد البر، جامع بیان العلم وفضلہ، جزء ثانی، صفحہ ۱۵۰

تمہاری طرف رینگ کر آگئی پچھلی امتوں کی بیماری —— حسد اور بغض۔

یہاں سرخ نشان اس بات کی علامت ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو چکی ہے۔ براہ کرم اپنا زر تعاون بذریعہ منی آرڈر بھیج کر شکریہ کا موقع دیں —— منیجر الرسالہ

فہرست

ایک صاحب سے ملاقات ہوئی جو عالم بھی ہیں۔ انھوں نے کہا: الرسالہ کی آواز انبیار والی آواز ہے۔ اس کے سوا ہمارے لئے نجات کا کوئی راستہ نہیں۔ اس کا تقاضا تو یہ ہے کہ سب کچھ چھوڑ کر میدان عمل میں نکل پڑیں۔ خواہ اس کے نتیجہ میں دنیا بالکل برباد ہو جائے۔

ایک اور صاحب جو الرسالہ کو شروع سے پڑھ رہے ہیں، اپنے خط میں لکھتے ہیں: "میں نے طے کیا ہے کہ اپنے کھیتوں میں زیادہ توجہ دوں اور اللہ سے دعا کروں کہ وہ میری مختصر زمین میں اتنی برکت دے کہ الرسالہ کی دعوتی مہم کے سلسلے میں اپنی آرزوؤں کو پورا کر سکوں۔ دوسری بات میں نے یہ طے کی ہے کہ اپنے یہاں پانچ پرچوں سے الرسالہ کی ایجنسی شروع کروں"

ہمارے نزدیک دوسری بات ہی اسلامی بات ہے۔ پہلی بات صرف ایک قسم کا وسوسہ ہے شیطان مختلف طریقوں سے آدمی کو بہکاتا ہے۔ اس میں سے ایک طریقہ یہ بھی ہے۔

اسلام کے لئے آج ہم کو جو کچھ کرنا ہے، وہ صرف دو چیزیں ہیں۔ یہ سمجھ کر زندگی گزارنا کہ کل ہم اللہ کے سامنے پیش ہونے والے ہیں۔ دوسرے اپنے بھائیوں میں صالح خیالات کی اشاعت۔ یہ دونوں کام ہر شخص کے لئے ممکن ہیں۔ اور ممکن دائرہ سے آغاز ہی کا نام کام ہے۔ غیر ممکن دائرہ سے آغاز کا منصوبہ بنانا خندق میں چھلانگ لگانا ہے۔ اور خدا نے کسی کو اس کا مکلف نہیں کیا ہے۔

تبدیلیوں کی حقیقت

بمبئی کو دروازۂ ہند (گیٹ وے آف انڈیا) کہا جاتا ہے۔ اس کی علامت کے طور پر وہاں سمندر کے کنارے اس نام کا ایک گیٹ بھی بنایا گیا ہے۔ یہ اس زمانہ کی یادگار ہے جب کہ سمندر کے راستہ سے ہندستان آنے والے لوگ بمبئی کی بندرگاہ پر اتر کر ہندستان میں داخل ہوتے تھے۔ مگر اب سفری حالات بدل چکے ہیں۔ اب ہندستان کا دروازہ بمبئی کا بندرگاہ نہیں بلکہ دہلی کا بین اقوامی ہوائی اڈہ ہے۔ اب بندرگاہوں کے بجائے ہوائی اڈوں کے ذریعہ ایک ملک کے لوگ دوسرے ملک میں داخل ہوتے ہیں۔ تاہم یہ فرق طریق داخلہ کا فرق ہے نہ کہ اصول داخلہ کا۔ اس سے نفس داخلۂ ہند کے قوانین پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

یہ ایک مثال ہے جس سے ان تبدیلیوں کی حقیقت سمجھی جاسکتی ہے جس کے حوالہ سے مذہب میں تبدیلی کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ بلاشبہ دنیا میں بہت سی تبدیلیاں ہوئی ہیں اور یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ یہ تبدیلیاں مذہب اور سماج کے درمیان پھر سے مطابقت کا تقاضا کرتی ہیں۔ مگر یہ صرف موجودہ حالات پر مذہب کے اصولوں کے از سر نو انطباق کا سوال ہے نہ کہ خود مذہب کو بدل کر نیا مذہب بنانے کا ـــــ قدیم زمانہ میں جانور سواری کا کام دیتے تھے۔ اب سفر کے لئے مشینی سواریاں استعمال ہوتی ہیں۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ ایک مسافر جس مقام پر پہنچنے کے لئے پہلے پورب کی طرف جاتا تھا، اب وہ اس کے لئے پچھم کی طرف دوڑنے لگے گا۔

"میرے لئے ایک سائیکل خرید دیجئے" بیٹے نے باپ سے کہا۔ باپ کی آمدنی کم تھی۔ وہ سائیکل خریدنے کی پوزیشن میں نہ تھا۔ اس نے ٹال دیا۔ لڑکا بار بار کہتا رہا اور باپ بار بار منع کرتا رہا۔ بالآخر ایک روز باپ نے ڈانٹ کر کہا "میں نے کہہ دیا کہ میں سائیکل نہیں خریدوں گا۔ اب آئندہ مجھ سے اس قسم کی بات مت کرنا۔"

یہ سن کر لڑکے کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ کچھ دیر چپ رہا۔ اس کے بعد روتے ہوئے بولا: "آپ ہی تو ہمارے باپ ہیں۔ پھر آپ سے نہ کہیں تو اور کس سے کہیں۔" اس جملہ نے باپ کو تڑپا دیا۔ اچانک اس کا انداز بدل گیا۔ اس نے کہا: اچھا بیٹے اطمینان رکھو میں تمہارے لئے سائیکل خریدوں گا۔ اور کل ہی خریدوں گا۔" یہ کہتے ہوئے باپ کی آنکھوں میں بھی آنسو آگئے۔ اگلے دن اس نے پیسہ کا انتظام کرکے بیٹے کے لئے نئی سائیکل خرید دی۔

لڑکے نے بظاہر ایک لفظ کہا تھا۔ مگر یہ ایک ایسا لفظ تھا جس کی قیمت اس کی اپنی زندگی تھی، جس میں اس کی پوری ہستی شامل ہوگئی تھی۔ اس لفظ کا مطلب یہ تھا کہ اس نے اپنے آپ کو اپنے سرپرست کے آگے بالکل خالی کر دیا ہے۔ یہ لفظ بول کر اس نے اپنے آپ کو ایک ایسے نقطہ پر کھڑا کر دیا جہاں اس کی درخواست اس کے سرپرست کے لئے بھی اتنا ہی بڑا مسئلہ بن گئی جتنا خود اس کے لئے۔

اس واقعہ سے سمجھا جاسکتا ہے کہ ذکرِ الٰہی کی وہ کون سی قسم ہے جو میزان کو بھر دیتی ہے اور جس کے بعد خدا کی رحمتیں بندے کے اوپر امنڈ آتی ہیں۔ یہ رٹے ہوئے الفاظ کی تکرار نہیں ہے۔ نہ اس کا کوئی "نصاب" ہے۔ یہ ذکر کی وہ قسم ہے جس میں بندہ اپنی پوری ہستی کو انڈیل دیتا ہے۔ جب بندے کی آنکھ سے عجز کا وہ قطرہ ٹپک پڑتا ہے جس کا تحمل زمین و آسمان بھی نہ کرسکیں۔ جب بندہ اپنے آپ کو اپنے رب کے ساتھ اتنا زیادہ شامل کر دیتا ہے کہ "بیٹا" اور "باپ" دونوں ایک ترازو پر آجاتے ہیں۔ یہ وہ لمحہ ہے جب کہ ذکر محض لغت کا لفظ نہیں ہوتا بلکہ ایک شخصیت کے پھٹنے کی آواز ہوتا ہے۔ اس وقت خدا کی رحمتیں اپنے بندے پر ٹوٹ پڑتی ہیں۔ بندگی اور خدائی دونوں ایک دوسرے سے راضی ہوجاتے ہیں۔ قادرِ مطلق عاجزِ مطلق کو اپنی آغوش میں لے لیتا ہے۔

مکمل تدبیر، اور اسی کے ساتھ اللہ پر مکمل اعتماد

انسان بیک وقت دو مختلف تقاضوں کے درمیان ہے۔ ایک عبدیت کا تقاضا، دوسرے امتحان کا۔ انسان کے حالت امتحان میں ہونے کا پہلو تقاضا کرتا ہے کہ وہ اپنے سارے اختیار اور اپنی تمام امکانیات کو بروئے کار لانے کی کوشش کرے۔ دوسری طرف عبدیت کا پہلو زور کرتا ہے اور کہتا ہے کہ ہر حال میں آدمی اللہ پر بھروسہ رکھے، اپنے کو یا اپنی تدبیروں کو کچھ نہ سمجھے۔ اسباب کا اہتمام ہمارے حالت امتحان میں ہونے کا اظہار ہے اور اللہ پر اعتماد ہماری عبدیت کا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے جب مکہ کے حالات اس حد تک سخت ہو گئے کہ لوگوں نے آپ کے قتل کا ارادہ کر لیا تو آپ اپنے وطن کو چھوڑ کر یثرب (مدینہ) چلے گئے۔ سیرت کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سفر کے لئے آپ نے ہر قسم کا ممکن اہتمام فرمایا —— سفر کے ہر جزء کو مکمل طور پر راز میں رکھا۔ عام شاہراہ کے بجائے غیر معروف راستہ سے سفر فرمایا۔ مکہ سے رات کے وقت پیدل نکلے اور سواری کا انتظام آگے ایک صحرائی مقام سے کیا۔ آپ کو مدینہ جانا تھا جو مکہ سے شمال کی جانب واقع ہے۔ مگر آپ نے اس کے الٹی طرف جنوبی سمت میں سفر فرمایا۔ مکہ کے باہر چند میل جا کر ایک سنسان پہاڑی غار (ثور) میں تین دن ٹھہرے رہے جو اتنا تنگ تھا کہ آدمی صرف لیٹ کر اس کے اندر داخل ہو سکتا تھا۔ وغیرہ وغیرہ۔

آپ جب ابوبکر صدیق کے ساتھ غار ثور میں مقیم تھے، قریش کے کچھ لوگ آپ کو ڈھونڈتے ہوئے غار کے کنارے تک پہنچ گئے۔ آہٹ پا کر ابوبکر صدیق نے کہا، دشمن اتنے قریب آچکا ہے کہ اگر انھوں نے جھک کر اپنے قدموں کے نیچے کی طرف دیکھا تو وہ ہم کو پالیں گے۔ آپ نے نہایت اطمینان کے ساتھ جواب دیا:

ماظنک باثنین یا ابابکر اللہ ثالثھما — ابوبکر! ان دو کی نسبت تمھارا کیا خیال ہے جن کا تیسرا اللہ ہو

اس واقعہ میں نبوت کا مقام نظر آ رہا ہے۔ ایک طرف تدبیر کمال درجہ پر۔ دوسری طرف اللہ پر اعتماد کمال درجہ پر۔ یہی نبوت کی شان ہے۔ پیغمبر اس شان عبدیت میں کمال درجہ پر ہوتا ہے۔ پیغمبر کے ساتھیوں اور فیض پانے والوں میں بھی یہ اوصاف درجہ بدرجہ پیدا ہوتے ہیں۔

یہ احترام نہیں، ناقدری ہے

فقہ کی کتابوں میں علی مرغینانی (۵۹۳ - ۵۱۱ ھ) کی کتاب "ہدایہ"، بہت مشہور اور مقبول کتاب ہے۔ علمائے احناف کے فتاوی کا مدار زیادہ تر اسی پر ہے۔ اگر کوئی شخص کہے کہ ہدایہ کی جلدوں کو سمجھ کر پڑھنے یا اس کا مطالعہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ بس اس کی "تلاوت" کر لینا کافی ہے۔ اس کو جلی حرفوں میں چھپوا لیا جائے اور الفاظ کی صحیح ادائگی کی ضمانت کے لئے اعراب بھی لگا دیئے جائیں اور اس کے بعد لوگوں کو دے دیا جائے کہ وہ صبح و شام اس کے الفاظ کو دہرایا کریں۔ اگر کوئی ایسا کہے تو سارے علماء اس کے مخالف ہو جائینگے۔ مگر حیرت انگیز بات ہے کہ قرآن کے بارے میں وہ ٹھیک اسی عمل پر راضی ہو گئے ہیں۔ جو بات انھیں شامی اور در مختار اور ہدایہ اور کنز الدقائق کے معاملہ میں بے معنی نظر آتی ہے، وہی بات قرآن کے معاملہ میں عین مطلوب بن گئی ہے۔

مجھے ایک بار سفر میں ایک نوجوان کی ہمراہی کا اتفاق ہوا۔ یہ ایک فیض یافتہ نوجوان تھا اور صوم و صلوٰۃ کا نہایت پابند تھا۔ وہ اپنے گلے میں ایک حمائل لٹکائے ہوئے تھا۔ ہمیشہ باوضو رہتا اور جہاں موقع ملتا، قرآن کھول کر اس کی تلاوت شروع کر دیتا۔ اس کا ذوق شوق دیکھ کر میں نے کہا: آپ عربی زبان بھی سیکھ لیجئے تاکہ جب آپ قرآن پڑھیں تو اس کو سمجھ بھی سکیں۔ میری اس بات کے جواب میں اس نے جو کچھ کہا وہ عام مسلمانوں کی نفسیات کی مکمل ترجمانی تھی: "ہم تو صرف ثواب کے لئے قرآن پڑھتے ہیں"

یہ حال اس کتاب کا ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے اس کے اتارنے کا مقصد ہی یہ بتایا ہے کہ لوگ اس پر غور کریں اور اس سے نصیحت اور عبرت حاصل کریں۔ (ص - ۲۹)

* *

زبانوں کی کثرت

مغرب نے جب ہندستان کے علمی ذخیرہ کی طرف توجہ کی تو اس نے زیادہ تر قدیم کلاسیکی ادب، سنسکرت ادب کو دیکھا۔ سر ولیم جونز نے کالی داس کو ہندستان کا شکسپیئر کہا (۱۷۸۹) گوئٹے نے ویدوں میں ایک نئی دنیا پائی جس میں وہ رہ سکتا تھا (۱۸۱۱) شوپنہار نے اعتراف کیا کہ اپنشد اس کے لئے زندگی کی تسکین رہی ہیں (۱۸۵۱) میکس مولر نے کہا کہ وید سے ہم اتنے ہی اہم سبق سیکھ سکتے ہیں جیسے کہ ہم ہومر اور درجل میں پاتے ہیں (۱۸۸۲)

اس کے مقابلہ میں جدید ہندستانی لٹریچر کی طرف مغرب نے بہت کم توجہ دی ہے۔ البرشٹ ویبر (۱۸۵۲) اور ڈاکٹر سوجیت مکرجی (۱۹۷۵) کے بیان کے مطابق اس کی وجہ ہندستانی زبانوں کی کثرت ہے۔ قدیم لٹریچر سے واقفیت کے لئے صرف سنسکرت کو جاننا ان کے لئے کافی ہو گیا تھا جب کہ جدید لٹریچر سے واقفیت کے لئے انھیں اتنی زیادہ زبانیں سیکھنی پڑیں گی جو البرشٹ ویبر کے الفاظ میں کسی ایک اسکالر کے امکان سے زیادہ ہیں۔

کبھی سیاست کو ترک کرنے ہی کا نام سیاست ہوتا ہے

اکتوبر ۱۹۴۴ میں دوسری عالمی جنگ اپنے شباب پر تھی۔ امریکہ، بحرالکاہل کے جزائر کو فتح کرتے ہوئے جاپان کے دروازہ تک پہنچ چکا تھا۔ اس وقت جاپان کے وائس ایڈمرل اونیشی (TAKIJIORO ONISHI) نے اپنی فوج کے اعلیٰ افسروں کے سامنے تقریر کرتے ہوئے کہا:

"میرے خیال سے اب ایک ہی راستہ رہ گیا ہے جس میں ہم یقین کر سکیں کہ ہماری معمولی طاقت زیادہ سے زیادہ موثر بن سکتی ہے۔ وہ یہ کہ ہم "زیرو فائٹرس" کا ایک دستہ بنائیں جو ۲۵۰ کیلوگرام کا بم لے کر دشمن کے سمندری جنگی جہازوں پر اپنے آپ کو گرا دیں"۔

اونیشی کی یہ تجویز ہوابازوں تک پہنچائی گئی۔ فی الفور منظوری کا فیصلہ ہو گیا۔ ہوابازوں کا ایک دستہ بنایا گیا جس کا نام تھا کامی کیز (KAMIKAZE) یہ ایک جاپانی لفظ ہے جس کے معنی ہیں "خدائی آندھی" یہ نام اس لئے اختیار کیا گیا کیونکہ تیرھویں صدی میں قبلائی خاں کے حملہ سے "ایک خدائی آندھی نے جاپان کو بچایا تھا" جس میں اس کی جنگی کشتیاں ایک سمندری طوفان نے تباہ کر ڈالی تھیں۔

اگست ۱۹۴۵ میں جنگ ختم ہوئی تو پانچ ہزار کی تعداد میں جاپانی ہواباز اس طرح اپنی جانیں دے چکے تھے۔ انھوں نے اکتوبر ۱۹۴۴ اور جون ۱۹۴۵ کے درمیان ۳۴ امریکی جنگی جہازوں کو تباہ کر دیا تھا۔

جاپان کے بہادر ہوابازوں نے کن جذبات کے ساتھ یہ قربانیاں دی تھیں، اس کا اندازہ ایک خط سے ہوگا۔ سسومو (SUSUMU KIJITSU) اسی قسم کا ایک ۲۲ سالہ جاپانی ہواباز تھا جس نے ایک بم لے کر اپنے ہوائی جہاز کو دشمن کے ایک سمندری جنگی جہاز پر گرایا تھا، اس نے آخری دن اپنے دفتر سے اپنے خاندان کو حسب ذیل خط لکھا:

"میرے پیارے والدین، پیارے بھائیو اور میری پیاری بہن!

یقیناً آپ کو اس کا علم نہیں ہوگا، مگر چند دن پہلے میں نے آپ کو الوداع کہی ہے جب کہ میں اپنے گھر کے اوپر پرواز کر رہا تھا، میرے جہاز کے بازوؤں کے سایہ نے ہمارے مکان کی چھت کو چھوا۔ میرے خیالات ہمہ تن آپ کی طرف لگے ہوئے تھے۔ میں جانتا ہوں کہ بہت جلد میرا وقت آجائے گا۔ مگر مجھے موت کا ڈر نہیں۔ مجھے صرف یہ فکر ہے کہ میرا عمل کیا جاپان کو بچانے کے لئے مفید اور فیصلہ کن ثابت ہوگا۔ میں اور میرے ساتھی یہ یقین رکھتے ہیں کہ ہماری قربانیاں ہمارے بعد کی نسلوں کے لئے فتح لے آئیں گی۔ ہم نہایت پرسکون ہیں۔ ہم اکثر مذاق کرتے ہیں اور اپنا وقت پڑھنے اور تاش کھیلنے میں گزارتے ہیں۔ آپ ہمارے لئے غمگین نہ ہوں۔ اس کے برعکس آپ کو فخر کرنا چاہئے کہ میرا جسم اگرچہ جلد ہی ختم ہو جائے گا مگر میری روح ہمیشہ آپ کے پاس رہے گی۔ ۔ ۔ ۔ اب الوداع، کیونکہ آخر وقت کی گھنٹی ہو چکی ہے۔

(آپ کا بیٹا اور بھائی سسومو)

تاہم تاریخ کی یہ انوکھی قربانی جاپان کو بچانے والی ثابت نہ ہو سکی۔ کیوں کہ دشمن کے پاس ایک اور برتر طاقت تھی جس کے مقابلہ میں جاپانی ہوابازوں کی یہ لامثال قربانی

Kamikaze: Suicide Pilots

بھی بے اثر تھی۔ یہ تھا ایٹم بم۔ ۶ اگست ۱۹۴۵ کو امریکی ہوائیہ نے دو ایٹم بم جاپان کی زمین پر گرائے جس نے ہیروشیما اور ناگا ساکی جیسے عظیم صنعتی شہروں کو چند منٹ میں خاک کا ڈھیر بنا دیا۔ اب جاپان کے لئے اس کے سوا کوئی راستہ نہ تھا کہ وہ امریکہ کے سامنے ہتھیار ڈال دے۔ تاہم جاپان کے لئے اب بھی راستے بند نہیں ہوئے۔ اب اس نے دوسرا طریقہ اختیار کیا۔ اس نے "جنگ کو جاری رکھنے کے لئے جنگ کے خاتمہ" کا اعلان کر دیا۔ جاپان کے شہنشاہ ہیرو ہیٹو نے ریڈیو پر قوم کو خطاب کرتے ہوئے کہا:

"— ہم ایک ناقابل برداشت صورت حال سے دوچار ہیں۔ مگر ہمیں اس ناقابل برداشت کو برداشت کرنا ہے تاکہ ہم جاپان کی اگلی نسلوں کی تعمیر نو کر سکیں۔"

جاپان نے امریکہ کے سیاسی اور فوجی اقتدار کو تسلیم کر لیا اور اس کے تحت غیر سیاسی میدانوں میں اپنی ترقی واستحکام کی تدبیریں شروع کر دیں۔ اب ان کا خصوصی نشانہ تھا سائنسی تعلیم اور جدید صنعت — "جنگ کو ختم کر کے جنگ جاری رکھنے" کی تدبیر کامیاب رہی۔ ۱۹۴۵ میں کئے گئے اس خاموش فیصلہ کا نتیجہ ۱۹۷۰ میں برآمد ہوا۔ ۲۵ سال تک "سیاست" چھوڑنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ جاپان ایک ناقابل تسخیر سیاسی طاقت بن گیا۔ سائنسی تعلیم، ٹکنالوجی، صنعت اور قومی کردار کی تعمیر میں جاپان نے جو غیر معمولی کامیابیاں حاصل کی تھیں، اس نے اپنے بالواسطہ اثرات پیدا کرنے شروع کئے۔ یہاں تک کہ امریکہ کے لئے اس کو نظر انداز کرنا ناممکن ہو گیا۔ امریکہ نے جزائر جاپان کا اقتدار جاپانی باشندوں کے حوالے کر دیا۔ اس کی فوجیں اوکی ناوا میں اپنے عظیم فوجی اڈہ کو خالی کر کے اپنے وطن واپس چلی گئیں۔

وہ ہار کو ماننا جانتا تھا

امریکہ کے ایک شخص نے ۱۸۳۱ میں تجارت کی۔ اس میں وہ ناکام ہو گیا۔ ۱۸۳۲ میں اس نے الکشن میں شکست کھائی۔ ۱۸۳۴ میں اس نے دوبارہ تجارت کی مگر اس بار بھی ناکام رہا۔ ۱۸۴۳ میں اس کو امید تھی کہ اس کی پارٹی اس کو کانگرس کی ممبری کے لئے نامزد کرے گی۔ مگر اس کی امید پوری نہ ہو سکی۔ ۱۸۵۵ میں وہ سینٹ کے لئے کھڑا ہوا مگر ہار گیا۔ ۱۸۵۸ میں دوبارہ اس کو سینٹ کے الکشن میں شکست ہوئی۔

یہ بار بار ناکام ہونے والا شخص ابراہام لنکن (۱۸۰۹ - ۱۸۶۵) تھا جو بالآخر ۱۸۶۰ میں امریکہ کا صدر چنا گیا اور آج وہ نئے امریکہ کا معمار سمجھا جاتا ہے۔ ڈاکٹر نارمن ونسنٹ پیل نے لنکن کی کامیابی کا راز یہ بتایا ہے: HE KNEW HOW TO ACCEPT DEFEAT وہ جانتا تھا کہ شکست کو کس طرح تسلیم کیا جائے۔

ایک تبصرہ جو بہت سی کتابوں پر صادق آتا ہے

"بھیم راؤجی ابیدکر" ایک تازہ مطبوعہ انگریزی کتاب ہے۔ ٹائمس آف انڈیا کا تبصرہ نگار اس کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتا ہے :

WHAT USEFUL PURPOSE THE BOOK SERVES ESCAPES ME COMPLETELY AS I THINK IT IS AN EXCELLENT EXAMPLE OF HOW A GOOD SUBJECT CAN BE TURNED INTO UNREADABLE BOOK FOR LACK OF EFFORT, AND ORIGINALITY IN ORGANISING ALREADY-KNOWN MASS OF FACTS.

Times of India, 5.2.1978

یہ کتاب کون سی مفید خدمت انجام دے گی، میں اس کو سمجھنے سے بالکل معذور رہا۔ میرا خیال ہے کہ یہ کتاب اس بات کی ایک شاندار مثال ہے کہ کس طرح ایک عمدہ موضوع، محنت اور نیاپن نہ ہونے کے سبب سے ایک ناقابل مطالعہ کتاب کی صورت اختیار کر سکتا ہے جب کہ اس موضوع پر لکھنے کے لئے کافی مواد موجود ہو۔

آگ : درخت کا خوبصورت بچہ

عبداللہ بن سلام رضی اللہ تعالیٰ عنہ علمار بنی اسرائیل میں سے تھے۔ جب رسول اللہ کے دست مبارک پر بیعت کی سعادت ان کو حاصل ہوئی تو انھوں نے عرض کیا کہ قرآن کے ساتھ تورات کی تلاوت بھی جاری رکھوں۔ آپ نے فرمایا، اقرأ هذا ليلة وهذا ليلة (ایک رات قرآن پڑھا کرو اور ایک رات تورات)

تذکرہ حفاظ ذہبی، جلد ۱، صفحہ ۲۶

قرآن کی صحیح رہنمائی میں اس قسم کی کتابوں کے پڑھنے سے جہاں تک میرا ذاتی تجربہ ہے، خود قرآن کے سمجھنے میں بھی مدد ملتی ہے۔ ایک دن میں یجروید کے اردو ترجمہ کا مطالعہ کر رہا تھا، ایک جگہ مجھے یہ فقرہ ملا: "اے اگنی تو خوبصورت بچہ ہے، پودوں میں سے نکالا ہوا، تاریکی کو دور کرتا ہوا، ماؤں سے شور کرتا ہوا پیدا ہوا ہے۔" (ادھیا ۱۱/۳۵) اس اشلوک نے معاً میرے دماغ کو قرآن کی ان آیتوں کی طرف منتقل کر دیا جن میں ارشاد ہوا ہے کہ تم دیکھتے ہو اس آگ کو جسے تم پیدا کرتے یا نکالتے ہو، کیا تم نے اس درخت کو اگایا، یا ہم ہیں اس کے اگانے والے۔" (الواقعہ) قریب قریب یہی مضمون سورہ یٰسین میں بھی ہے۔ عام مفسرین، عرب کے بعض خاص درختوں کا ذکر کر کے لکھ دیتے ہیں کہ ان کی شاخوں کو باہم رگڑ کر عرب آگ پیدا کیا کرتے تھے، اسی کی طرف اشارہ ہے۔ لیکن یجروید کا یہ طرز تعبیر قرآن کے طرز تعبیر سے اس درجہ ملتا جلتا تھا کہ خیال گزرا کہ کیوں نہیں قرآن میں بھی "درخت" کو عام درخت سمجھا جائے اور جیسے وید میں ہے کہ آگ خوبصورت بچہ ہے پودوں سے نکالا ہوا۔ یعنی آگ کا ظہور لکڑی ہی کے جلنے سے ہوتا ہے اور اسی سے شور کرتا ہوا پیدا ہوتا ہے، قرآن میں بھی کیا اسی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ (مولانا مناظر احسن گیلانی)

خدا کی کائنات میں غور و فکر سب سے بڑی عبادت ہے

حدیث میں آیا ہے کہ ایک گھڑی کا سوچنا ستر برس کی عبادت سے افضل ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ جو شخص تنہائی میں اللہ کو یاد کرے، وہ ایسا ہے جیسے اکیلا کفار کے مقابلہ میں چل دیا ہو۔ ایک حدیث کے مطابق سات آدمی وہ ہیں جن کو اللہ اس دن اپنے سایہ کے نیچے جگہ دے گا جب کہ اس کے سایہ کے سوا کوئی سایہ نہ ہوگا۔ ان میں سے ایک وہ ہے جو اللہ کو تنہائی میں یاد کرے اور اس کی آنکھ سے آنسو بہہ پڑیں۔

ایک حدیث میں ہے کہ قیامت کے دن ایک آواز دینے والا آواز دے گا کہ عقل والے لوگ کہاں ہیں۔ لوگ پوچھیں گے، عقل والے کون ہیں۔ جواب دیا جائے گا، وہ لوگ جو اللہ کو کھڑے، بیٹھے اور لیٹے یاد کرتے رہے اور آسمان اور زمین کی تخلیق میں غور کرتے تھے اور کہہ اٹھتے تھے، خدایا تو نے ان کو عبث پیدا نہیں کیا۔ تو پاک ہے۔ پس ہم کو جہنم کے عذاب سے بچا۔ ابن ابی الدنیا نے ایک مرسل روایت نقل کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک بار صحابہ کی ایک جماعت کے پاس آئے۔ وہ لوگ چپ چاپ بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ نے فرمایا، کیا سوچ رہے ہو۔ انھوں نے جواب دیا، اللہ کی مخلوقات میں غور کر رہے ہیں۔ آپ نے فرمایا۔ ہاں اللہ کی ذات میں غور نہ کرو، اللہ کی مخلوقات میں غور کیا کرو۔

ابو ہریرہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں کہ ایک شخص چھت پر لیٹا ہوا آسمان اور ستاروں کو دیکھ رہا تھا۔ اس پر خدا کی عظمت کا تاثر قائم ہوا اور بولا: "خدا کی قسم مجھے یقین ہے کہ تمھارا پیدا کرنے والا کوئی ضرور ہے، اے اللہ تو مجھے بخش دے۔" خدا کی رحمت اس کی طرف متوجہ ہوئی اور وہ بخش دیا گیا۔ عبداللہ بن عباس کہتے ہیں، ایک ساعت کا غور تمام رات کی عبادت سے افضل ہے۔ ام درداء سے پوچھا گیا کہ ابو درداء کی محبوب عبادت کیا تھی، فرمایا غور و فکر۔ ابو ہریرہ کی ایک روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایک ساعت کا غور و فکر ساٹھ برس کی عبادت سے افضل ہے۔ حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ کی وہ مخفی یاد جس کو فرشتے بھی نہ سن سکیں، اس کا ثواب ستر درجہ زیادہ ہے۔

عبادہ بن صامت نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کیا ہے کہ بہترین ذکر خاموش ذکر ہے اور بہترین رزق وہ ہے جو کفایت کا درجہ رکھتا ہو۔ ایک حدیث کے مطابق آپ نے فرمایا کہ اللہ کو ذکر خامل سے یاد کیا کرو، پوچھا گیا، ذکر خامل کیا ہے۔ فرمایا "مخفی یاد۔"

یہی وہ ذکر (یاد الٰہی) ہے جس کے بارے میں ارشاد ہوا ہے کہ جو ایسا کرے اس کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں خواہ وہ سمندر کے جھاگ کے برابر ہوں۔

عن ابی هریرة قال سمعت رسول الله صلی الله علیه   نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، دنیا ملعون ہے اور جو کچھ

وسلم یقول الدنیا ملعونة وملعون مافیھا الاذکر اللہ وما والاہ وعالما ومتعلما

دنیا میں ہے وہ بھی۔ مگر اللہ کی یاد اور وہ چیز جو اس کے قریب ہو اور عالم اور طالب علم۔

امام غزالی نے لکھا ہے کہ غور وفکر کو افضل عبادت اس لئے کہا گیا کہ اس میں ذکر (یاد الٰہی) تو موجود ہوتا ہی ہے، اسی کے ساتھ اس میں دو چیزوں کا اور اضافہ ہو جاتا ہے۔ ایک اللہ کی معرفت، کیونکہ غور وفکر معرفت کی کنجی ہے، دوسرے، اللہ کی محبت کہ وہ فکر سے پیدا ہوتی ہے۔

عبداللہ بن مسعود کہتے ہیں، اگر علم چاہتے ہو تو قرآن کے معانی پر غور کرو کہ اس میں اولین وآخرین کا علم ہے۔

یوں آتی ہے آفت، اور آخرت کی آفت سب سے بڑی ہے

جب کسی کو مال واولاد کی نعمت ملتی ہے تو وہ دراصل خدا کی طرف سے ہوتی ہے۔ اس کا شکرانہ یہ ہے کہ آدمی ان کو اپنی ذاتی چیز نہ سمجھے بلکہ دوسروں کو بھی اس میں حق دار سمجھے اور کمزور طبقات کے لئے بھی اس میں حصہ لگائے۔ خدا کی نعمت پانے کے بعد "مناع للخیر" بن جانا خدا کو سخت ناپسند ہے۔ اس قسم کا فعل نہ صرف آخرت میں آدمی کے لئے بوجھ بنے گا۔ بلکہ اندیشہ ہے کہ دنیا میں بھی ملی ہوئی نعمت اس سے چھین نہ لی جائے۔

قرآن میں ایک واقعہ بیان ہوا ہے جس کا ترجمہ یہ ہے:

" ہم نے اسی طرح ان کو آزمائش میں ڈالا ہے جس طرح ہم نے باغ والوں کو آزمائش میں ڈالا تھا۔ جب انھوں نے قسم کھائی کہ اپنے باغ کا پھل صبح سویرے ضرور توڑیں گے۔ ان کو ایسا وثوق تھا کہ انھوں نے یہ نہ کہا کہ "اگر خدا چاہے"۔ پھر رات کو جبکہ وہ ابھی سو رہے تھے، تمھارے رب کی طرف سے ایک آفت اس باغ پر پھر گئی اور اس کا حال ایسا ہو گیا جیسے روندی ہوئی فصل۔ وہ صبح کو اٹھے اور ایک دوسرے کو پکارا، اگر تم کو پھل توڑنا ہے تو سویرے اپنے کھیت پر چلو۔ پھر وہ لوگ چل پڑے۔ آپس میں چپکے چپکے کہہ رہے تھے کہ آج تمھارے باغ میں کوئی محتاج نہ آنے پائے۔ وہ یہ سمجھ کر جا رہے تھے کہ وہ اس پر قادر ہیں۔ مگر جب وہاں پہنچے اور باغ کی حالت دیکھی تو کہنے لگے "یقیناً ہم راستہ بھول گئے ہیں"۔ پھر جب حقیقت معلوم ہوئی تو بولے "ہماری قسمت پھوٹ گئی"۔

ان میں جو بہتر آدمی تھا، وہ بولا۔ میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ تم خدا کی پاکی کیوں نہیں بولتے۔ انھوں نے جواب دیا۔ واقعی پاک ہے ہمارا رب، بے شک ہم ہی قصور وار ہیں۔ پھر ایک دوسرے پر ملامت کرنے لگا، انھوں نے کہا، افسوس ہمارے حال پر، بلاشبہ ہم سرکش ہو گئے تھے، بعید نہیں کہ ہمارا رب اس کے بدلے ہمیں اس سے بہتر باغ عطا کرے۔ ہم اس کی طرف رجوع کرتے ہیں ـــ یوں آتی ہے آفت اور آخرت کی آفت تو سب سے بڑی ہے۔ القلم ۳۳ - ۱۷

بہت سے چمک دار سکے آخرت کے بازار میں کھوٹے ثابت ہوں گے

سعدی شیرازی کا ایک شعر ہے

بزرگ زادہ ناداں بہ شہر دا ماند
کہ در دیار غریبش بہ ہیچ نستانند

"شہر دا" کے معنی ہیں رواج دادۂ حکومت۔ اس سے مراد وہ نقود یا سکے ہیں جن کو کسی حکومت نے رائج کر رکھا ہو۔ ایسے سکے کی قیمت صرف اس حکومت کے حدود میں ہوتی ہے۔ اس سے باہر اس کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔ سعدی شیرازی کہتے ہیں کہ بڑے آدمی کے کوئی صاحبزادے جو خود ناداں ہوں، وہ اپنے وطن میں اپنے باپ کی وجہ سے عزت دار بنے رہتے ہیں، مگر اپنے وطن سے باہر اسی طرح بے قیمت ہو جاتے ہیں جس طرح ایک ملک کا نوٹ دوسرے ملک میں اپنی قیمت کھو دیتا ہے۔

موجودہ دنیا میں اللہ تعالٰے نے شیطان کو آزاد

خواہ دنیا میں وہ کتنے ہی

کامیاب دکھائی دیتے ہوں

چھوڑ دیا ہے۔ جو لوگ شیطان کے پسند کئے ہوئے راستوں پر چلتے ہیں، ان کو یہاں بہت جلد عزت اور ترقی حاصل ہو جاتی ہے۔ مگر اس قسم کے لوگ جیسے ہی اگلی دنیا میں داخل ہوں گے وہ بالکل بے قیمت ہو جائیں گے۔ کیونکہ اگلی دنیا وہ ہے جہاں شیطان کی عمل داری مکمل طور پر ختم ہو جاتی ہے۔ جو لوگ شیطان کی سرپرستی کی وجہ سے موجودہ دنیا میں عزت دار بنے ہوئے تھے وہ وہاں مکھی اور مچھر سے زیادہ بے قیمت ہوں گے کیوں کہ وہاں عزت صرف اس کے لئے ہے جس کو خدا اپنی سرپرستی میں لے لے۔

علی بن ابی طالب، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے داماد تھے۔ ان کے یہاں پہلا لڑکا پیدا ہوا تو انھوں نے اس کا نام حرب (جنگ) تجویز کیا۔ آپؐ نے اس کو پسند نہیں کیا اور اس کے بجائے لڑکے کا نام "حسن" رکھا۔ علی بن ابی طالب کے یہاں دوسرا لڑکا پیدا ہوا تو انھوں نے دوبارہ چاہا کہ اس کا نام حرب رکھیں۔ آپؐ نے فرمایا نہیں، اس کا نام حسین رکھو۔
(منہاج السنۃ النبویۃ لابن تیمیہ)

جنگ اور تصادم اسلام میں اتنا زیادہ ناپسندیدہ ہے کہ ہر قیمت پر اس سے بچنے کا حکم دیا گیا ہے، قرآن میں ہدایت کی گئی ہے کہ تمھارا حریف اگر صلح کے لئے آگے بڑھے تو تم بھی آگے بڑھ کر اس سے صلح کر لو۔ حتی کہ اگر یہ اندیشہ ہو کہ حریف صلح کے پردہ میں تم کو دھوکا دینا چاہتا ہے تب بھی اس کی پرواہ مت کرو اور اللہ پر بھروسہ کرتے ہوئے اس سے صلح کر لو (الانفال ۶۱)

ذکر و دعا کی حقیقت

"فلاں دعا بہت مجرب ہے، اس کو پڑھا کرو"۔ "فلاں ذکر کی بڑی فضیلت ہے، صبح و شام اس کا ورد کیا کرو"۔ اس قسم کی باتیں اکثر سننے میں آتی ہیں۔ بے شمار کتابیں لوگوں نے لکھ رکھی ہیں جن میں اس قسم کے "مجربات" جمع کیے گئے ہیں۔ حتیٰ کہ کتنی بزرگی کی دکانیں اسی لئے قائم ہیں کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ ان کو دعاؤں اور اذکار کے قیمتی نسخے معلوم ہیں، لوگ وہاں حاضری دیتے ہیں اور وہ پُراسرار طور پر ان کو ایسے مجربات کی تلقین کرتے ہیں جو ان کو سینہ بہ سینہ پہنچے ہیں۔

مگر یہ ساری باتیں قطعاً بے اصل ہیں۔ دعا یا ذکر کوئی جادو کا منتر نہیں ہے جس کے سارے کمالات کچھ مقرر الفاظ میں چھپے ہوئے ہوں۔ اگر یہ خاص الفاظ مقرر طریقے پر زبان سے پڑھ دیئے جائیں تو اس کی تاثیر ظاہر ہو جائے گی اور اگر الفاظ اور طریقے میں کچھ فرق ہو گیا تو منتر کا طلسماتی کمال ظاہر نہیں ہو گا۔ دعا یا ذکر دل کی کیفیات اور اندرونی تڑپ کا نام ہے نہ کہ پُراسرار الفاظ کے کسی مجموعہ کا۔

قصہ مشہور ہے کہ کہیں ایک بند محل تھا۔ اس محل کے اندر بے شمار خزانہ بھرا ہوا تھا، مگر وہ کسی کنجی سے نہیں کھلتا تھا، بلکہ ایک منتر سے کھلتا تھا۔

ایک شخص کو اس محل کی تلاش ہوئی۔ برسوں تک پہاڑوں اور جنگلوں میں گھومنے کے بعد اسے ایک شخص ملا جو اس جادوئی محل کا راز جانتا تھا۔ اس نے اس کا پتہ بتایا اور کہا کہ تم اس کے سامنے پہنچو تو کہنا "کھل اے سم سم"۔ یہ کہتے ہی محل کا دروازہ کھل جائے گا اور تم اس میں داخل ہو جانا۔

اب آدمی نے سفر شروع کیا۔ چلتے چلتے بالآخر وہ خزانہ کے اس محل تک پہنچ گیا۔ مگر بدقسمتی سے وہ اس کو کھولنے کا منتر بھول گیا۔ وہ محل کے بھاری دروازہ کے سامنے کھڑا ہو کر طرح طرح کے ملتے جلتے الفاظ دہراتا رہا: ٹم ٹم، بم بم، چم چم۔ مگر دروازہ نہیں کھلا۔ کیونکہ وہ تو ایک خاص لفظ کے بولنے ہی سے کھلتا تھا اور آدمی وہ لفظ بھول چکا تھا۔

وہ دوبارہ محل کے عارف کی طرف روانہ ہوا اور دریاؤں اور بیابانوں کا سفر کرکے اس سے ملاقات کی۔ عارف نے دوبارہ اس کو بتایا کہ اس جادوئی محل کا منتر "سم سم" ہے۔ اب اس نے اس منتر کو خوب رٹ ڈالا اور دوبارہ سفر کرکے محل کے پاس پہنچا۔ اب وہ محل کے سامنے کھڑا ہوا تو اس کو اس کا جادوئی منتر خوب یاد تھا۔ اس نے کہا "کھل اے سم سم"، ان الفاظ کا زبان سے نکلنا تھا کہ محل کا دروازہ کھل گیا اور خزانوں کی چمکتی ہوئی دنیا اس کے سامنے آگئی۔

بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ دعا اور ذکر بھی اسی طرح "سم سم" کی قسم کے منتر ہیں، مگر یہ دین سے انتہائی ناواقفیت کی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ کو بندوں سے جو چیز مطلوب ہے وہ اخبات و انابت (دل کا جھکاؤ اور توجہ) ہے نہ کہ لفظی طلسمات۔ حدیث میں آتا ہے کہ ایک دیہاتی کا اونٹ گم ہو گیا۔ وہ بیتابانہ اس کو ڈھونڈ رہا تھا۔ لمبی تلاش اور دوڑ دھوپ کے بعد جب اونٹ اس کو ملا تو اس کا دل شکر الٰہی کے جذبہ سے بھر گیا اور بے اختیار اس کی زبان سے نکلا نہ

اللھم انت عبدی دانا ربک خدایا تو میرا بندہ ہے
اور میں تیرا رب ہوں۔

لفظوں کے اعتبار سے دیکھئے تو یہ کفر کا کلمہ ہے۔ مگر یہ الفاظ اللہ تعالےٰ کو اتنے پسند آگئے کہ اس کو خدا کے مقبول بندوں میں شامل کر دیا گیا۔ کیونکہ حدیث کے الفاظ میں "اللہ ہمارے ظاہر کو نہیں دیکھتا، وہ ہمارے قلب اور ہمارے باطن کو دیکھتا ہے۔"

دعا اور ذکر دین کی سب سے اعلیٰ حقیقتیں ہیں۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ کچھ پُراسرار قسم کی عربی منتر ہیں۔ ان کو رٹ کر خاص خاص وقت میں دہرا دو اور محل کے دروازے کھل جائیں گے۔ دعا کی حقیقت بندے کا اپنے مالک کو پکارنا ہے۔ اسی طرح ذکر کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کا خوف اور محبت اس طرح دل پر چھا جائے کہ ہر وقت اس کی یاد آتی رہے۔ دعا اور ذکر وہی افضل ہے جو دل کی گہرائیوں سے نکلے، خواہ وہ اپنی مادری زبان میں ہو۔ خواہ اونٹ والے کی طرح وہ بے ڈھنگے الفاظ میں کیوں نہ ادا ہوئی ہو۔

خلیفہ ثانی کی نصیحت

حضرت عمر کی خلافت کے زمانہ میں عراق پر شاہانِ کسریٰ کا قبضہ تھا۔ اس وقت جس بادشاہ کی حکومت تھی اس کا نام یزدجرد تھا۔

عراق کے ساتھ لڑائی کے زمانہ میں ایک بار خلیفہ ثانی نے ارادہ کیا کہ وہ خود محاذ جنگ پر جا کر اسلامی فوجوں کی کمان کریں، مدینہ میں مشورہ ہوا۔ اکثر مسلمانوں کی رائے ہوئی کہ آپ کو خود جانا چاہئے۔ مگر خواص نے رائے دی کہ آپ دار السلطنت میں ٹھہریں اور یہاں رہ کر لشکروں کی روانگی کا انتظام کریں، یہی زیادہ بہتر ہے۔

دوسری رائے کے حق میں فیصلہ ہوا اور سعد بن ابی وقاص کو عراق روانہ کیا گیا جہاں اس وقت قادسیہ کے مقام پر جنگ ہو رہی تھی۔ حضرت سعد روانہ ہونے لگے تو حضرت عمر نے ان کو وصیت فرمائی۔ اس وصیت کا خلاصہ یہ تھا:

"سعد! تمھیں یہ بات دھوکے میں نہ ڈالے کہ تم رسول اللہ کے ماموں کہلاتے ہو اور آپؐ کے صحابی ہو۔ اللہ برائی کو برائی سے نہیں دھوتا بلکہ برائی کو بھلائی سے دھوتا ہے۔ اللہ اور بندوں کے درمیان کوئی رشتہ داری نہیں۔ اس کے یہاں صرف اس کی بندگی مقبول ہوتی ہے۔ اللہ کے یہاں شریف رذیل سب برابر ہیں۔ سب اس کے بندے ہیں اور وہ سب کا رب ہے۔ اس کے انعامات بندگی سے حاصل ہوتے ہیں۔ ہر معاملہ میں اس چیز کو دیکھنا جو رسول اللہ کا طریقہ تھا، وہی عمل کی چیز ہے۔ میری اس نصیحت کو یاد رکھنا۔ تم ایک بڑے کام کے لئے بھیجے جارہے ہو۔ اس سے چھٹکارا صرف حق کے اتباع سے ہو سکتا ہے۔

اپنے آپ کو اور اپنے ساتھیوں کو خیر کا عادی بنانا۔ اللہ کے خوف کو اختیار کرنا۔ اور اللہ کا خوف دو باتوں میں جمع ہوتا ہے۔ اس کی اطاعت میں اور گناہ سے پرہیز کرنے میں۔ اور اللہ کی اطاعت جس کو بھی نصیب ہوئی، دنیا سے بے رغبتی اور آخرت سے محبت کے ذریعہ نصیب ہوئی۔

آر۔ ایس۔ ایس۔ اور مسلمان

ڈاکٹر کیبشو بلی رام ہیڈگوار (۱۸۹۰-۱۹۴۰)
آر۔ ایس۔ ایس۔ کے بانی ہیں۔ انھوں نے ۱۹۲۵ میں اس تنظیم کو قائم کیا تھا۔ ڈاکٹر ہیڈگوار کے بعد ۱۹۴۰ میں گرو گولوالکر اس کے سرسنچالک مقرر ہوئے۔ ۱۹۷۳ میں ان کے انتقال کے بعد سے بالا صاحب دیوراس (۶۲) اس تنظیم کے سرسنچالک ہیں۔

مسٹر رمیش چندر نے ناگ پور میں بالا صاحب دیوراس سے ایک انٹرویو لیا۔ اس انٹرویو کا ایک سوال و جواب یہ تھا:

"Muslims Are Wary"

Q: Is it true that Muslims are rather wary about joining the Sangh? You had once earlier referred to certain changes that will have to be made before opening your doors to non-Hindus. What exactly are these?

A: No, I don't think I have referred to certain changes that will have to be made before opening our doors to other communities. But it is true that Muslims are rather wary and not enthusiastic about joining the Sangh. Which is why I did say that it is only the Hindus who ask us to admit Muslims and not the Muslims themselves. Till today they have not come forward. What I have said possibly in my speeches is that some Muslims came to see me here. We have had some discussions. I have told them: Look here, you are proselytising people. You believe you have the right to convert and you believe that it is your duty to convert. That is not our way of thinking. We started the shuddhi programme just recently. But, then again, that is only as a reaction. In the old days there was no shuddhi.

Remember Swami Vivekananda went to America. He gave lectures on the Vedas, Upanishads, Gita. The Americans appreciated the lectures. Thousands became his disciples. But he did not convert a single American to Hinduism. That is our thinking.

سوال: کیا یہ صحیح ہے کہ مسلمان آر۔ ایس۔ ایس۔ میں شامل ہونے کے معاملہ میں بہت محتاط ہیں۔ آپ نے اس سے پہلے ایک بار کہا تھا کہ غیر ہندوؤں کو سنگھ میں لینے سے پہلے اس میں کچھ تبدیلیاں کی جائیں گی۔ وہ تبدیلیاں کیا ہیں۔

جواب: نہیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ میں نے ایسی تبدیلیوں کا ذکر کیا تھا جو دوسرے فرقہ کے لوگوں کے لئے سنگھ کا دروازہ کھولنے سے پہلے کی جائیں گی۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ سنگھ میں شامل ہونے کے معاملہ میں مسلمان محتاط ہیں نہ کہ پُرجوش۔ اسی لئے میں کہتا ہوں کہ یہ صرف ہندو ہیں جو ہم سے کہتے ہیں کہ مسلمانوں کو سنگھ میں شامل کیا جائے۔ مسلمان خود نہیں کہتے۔ اب تک وہ آگے نہیں بڑھے ہیں۔ میں نے اپنی تقریروں میں جو کچھ کہا ہوگا وہ صرف یہ کہ کچھ مسلمان یہاں مجھ سے ملنے کے لئے آئے۔ ہمارے درمیان کچھ باتیں ہوئیں میں نے ان کو بتایا۔ دیکھئے، آپ لوگوں کو مسلمان بناتے ہیں۔ آپ سمجھتے ہیں کہ آپ کو مسلمان بنانے کا حق ہے اور یہ آپ کا فریضہ ہے مگر یہ ہمارا سوچنے کا طریقہ نہیں۔ ہم نے شدھی کا پروگرام ابھی جلد ہی شروع کیا ہے۔ یہ صرف ردعمل کے طور پر وجود میں آیا۔ قدیم زمانہ میں یہاں کوئی شدھی نہ تھی۔

دیکھئے، سوامی ویویکانند امریکہ گئے۔ وہاں انھوں نے ویدوں پر، اپنشدوں پر اور گیتا پر لکچر دئے۔ امریکیوں نے ان لکچروں کو پسند کیا۔ ہزاروں ان کے معتقد بن گئے۔ مگر انھوں نے ایک امریکی کو بھی ہندو نہیں بنایا۔ یہ ہمارا سوچنے کا طریقہ ہے۔

دی السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا۔ ۱۲ مارچ ۱۹۷۸

غلط وہ نہیں ہے جو غلطی کرے —
غلط وہ ہے جو غلطی کا اعتراف نہ کرے

اپنی محبوب شخصیتوں کے چرچے ہیں مگر خدا کے چرچے نہیں

کوئی تحریک کیسی ہے، اس کو جاننے کا سب سے زیادہ یقینی ذریعہ یہ ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ اس سے جو لوگ متاثر ہوتے ہیں ان میں کیسا مزاج بنتا ہے۔ دور اول میں قرآن نے صحابہ کے اندر جو مزاج پیدا کیا، وہ خدا پرستی اور آخرت پسندی کا مزاج تھا۔ ان میں کے چند آدمی جب ایک جگہ بیٹھتے تو وہ خدا و آخرت کے چرچے کرتے، ان کے جوتے کا تسمہ بھی ٹوٹ جاتا تو ان کو خدا یاد آتا۔ ہوا اگر تیز ہو جاتی، تب بھی وہ کانپ جاتے کہ کہیں قیامت نہ آگئی ہو۔

موجودہ زمانہ میں اسلام کے نام پر جو تحریکیں اٹھیں اور ان سے جو لوگ متاثر ہوئے، ان کو دیکھئے تو کسی میں یہ مزاج دکھائی نہ دے گا —— کسی تحریک نے یہ مزاج پیدا کیا ہے کہ اس کے چند وابستگان جب کہیں اکٹھا ہوتے ہیں تو ان کا سب سے زیادہ محبوب مشغلہ یہ ہوتا ہے کہ اپنے بزرگوں کی فضیلتیں اور کرامتیں بیان کریں۔ کسی تحریک نے اپنے لوگوں کو ایک قسم کا عملیاتی اسلام تقسیم کر رکھا ہے اور اس کا ہر فرد اس کے طلسماتی فوائد کا ٹیپ ریکارڈ بنا ہوا ہے۔ کسی تحریک نے اسلام کے نام پر ایک عجیب و غریب قسم کا سیاسی مزاج بنایا ہے۔ اس کے متاثر افراد کا لذیذ ترین موضوع گفتگو صرف وہ چیزیں ہوتی ہیں جن میں سیاست کی چاشنی ہو۔ وہ وہیں متحرک ہوتے ہیں جہاں کوئی سیاسی اقدام کا موقع ہو۔ خواہ یہ سیاسی اقدام عملاً سیاسی خندق میں چھلانگ لگانے کے ہم معنی کیوں نہ ہو۔

آج کل جس اسلامی گروہ کو دیکھئے سب کا یہی حال نظر آئے گا۔ ان کی مجلسوں میں اپنے "حضرت" کے چرچے ہیں۔ مگر خدا کے چرچے نہیں۔ ان کی زبانوں پر کرامات اسلام کی داستانیں ہیں۔ مگر اس اسلام کی گونج نہیں، جو خدا کا خوف اور بندوں کی خیر خواہی پیدا کرتا ہے۔ ان کے یہاں سیاسی مسائل پر بحثیں ہیں۔ مگر قیامت میں قائم ہونے والی عظیم عدالت کے ذکر سے ان کی صحبتیں خالی ہیں۔ ان حالات میں بڑی بڑی اسلامی تحریکوں کے وجود میں آنے کے باوجود اگر اسلام سربلند نہ ہو رہا ہو تو تعجب کی کوئی بات نہیں، کیونکہ خدا کی نصرت خدا والے دین پہ نازل ہوگی نہ کہ ہمارے اپنے بنائے ہوئے دین پر۔

اعلان

دفتر کو الرسالہ کے حسب ذیل شمارے درکار ہیں :

الرسالہ جنوری ۱۹۷۷
جولائی ۱۹۷۷
اکتوبر ۱۹۷۷
نومبر ۱۹۷۷

جو لوگ فراہم کر سکتے ہوں، براہ کرم مطلع فرمائیں

منیجر الرسالہ

اس کا حسد اس کے لئے حق کو قبول کرنے میں رکاوٹ بن گیا

قرآن میں ایک کردار کو ان لفظوں میں بیان کیا گیا ہے:

"ان کے سامنے اس شخص کا حال بیان کرو جس کو ہم نے اپنی نشانیاں دی تھیں۔ مگر وہ اس سے نکل بھاگا۔ پھر شیطان اس کے پیچھے لگ گیا۔ یہاں تک کہ وہ گمراہ ہو کر رہ گیا۔ اگر ہم چاہتے تو اس کو ان نشانیوں کے ذریعہ بلند مرتبہ کر دیتے۔ مگر وہ تو بالکل دنیا کی طرف جھک پڑا اور اپنی خواہش کی پیروی کرنے لگا۔ سو اس کی حالت کتے کی سی ہو گئی کہ اگر تم اس پر بوجھ لادو تب بھی ہانپے اور چھوڑ دو تب بھی ہانپے۔ یہی مثال ان لوگوں کی ہے جو ہماری نشانیوں کو جھٹلاتے ہیں۔ تم یہ قصہ ان کو سناؤ، شاید کہ وہ سوچیں۔ اعراف۔ ۱۷۶

یہاں ایک شخص کی مثال دے کر بتایا گیا ہے کہ آدمی جب حق سے انکار کرتا ہے تو اس کی نفسیات کیا ہوتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے اندر فطری طور پر حق کی معرفت رکھ دی ہے۔ اس کے بعد مزید اہتمام یہ ہے کہ لوگوں کے سامنے ایسے واقعات لائے جاتے ہیں اور ان پر ایسی حقیقتیں روشن کی جاتی ہیں کہ سچائی ان کے لئے ایک جانی پہچانی چیز بن جائے۔ مگر اس کے باوجود اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی محض مفادات اور مصالح کی بنا پر حق کو ماننے سے انکار کر دیتا ہے۔ وہ حق کی پرستش کو صرف اس لئے چھوڑ دیتا ہے کہ اسے اندیشہ ہوتا ہے کہ اس کے بعد وہ خود اپنی پرستش کرنے یا کرانے کے مواقع سے محروم ہو جائے گا۔

مفسرین کا ایک گروہ اس طرف گیا ہے کہ اس آیت میں جس شخص کی مثال دی گئی ہے، وہ عرب کا رئیس اور شاعر امیہ ابن ابی الصلت ثقفی ہے۔ اس نے اپنی تمام زندگی کاروبار میں گزاری۔ تجارتی سفروں کے سلسلے میں شام اور یمن وغیرہ کا سفر کرتا رہتا تھا۔ ان سفروں میں اس کی ملاقات عیسائی راہبوں اور پادریوں سے ہوئی۔ قدیم آسمانی کتابوں کے کچھ حصے سنے۔ چونکہ اس کی طبیعت میں دینداری تھی، بہت جلد متاثر ہو گیا۔ شراب چھوڑ دی۔ ٹاٹ پہننے لگا۔ بتوں پر اعتقاد نہ رہا۔ دین ابراہیمی کی بابت اس کا ایک شعر ہے:

كل دين يوم القيامة عند الله الا دين الحنيفة زور

قیامت کے دن اللہ کے یہاں دین حنیفی کے سوا ہر دین باطل ہوگا

ایک نظم کے چند اشعار یہ ہیں:

الحمد لله ممسانا ومصبحنا بالحمد صبحنا ربي ومسانا

رب الحنيفة لم تنفد خزائنه مملوءة طبق الآفاق سلطانا

الا نبي لنا منا نيخبرنا ما بعد غايتنا من رأس محيانا

تعریف خدا کی ہے صبح و شام جو ہماری صبح و شام بخیر کر رہا ہے۔ دین ابراہیمی کا رب ہے، اس کے خزانے بھرے ہوئے ہیں کبھی ختم نہیں ہوتے۔ سارے جہان پر اس کی فرماں روائی ہے۔ کیا ہمارا کوئی پیغمبر نہیں جو ہمیں بتائے

کہ ہماری زندگی کی ابتدا اور انتہا میں کتنا فاصلہ ہے۔

اس کے ان الفاظ سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک مخلص شخص تھا، اور اس کو خدا کے پیغمبر کی تلاش تھی مگر اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی ایک "مرد کامل" کے لئے اپنے شوق کا اظہار کرتا ہے۔ حالاں کہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ لوگ خود اس کو وہ مرد کامل مان لیں اور اس کی پرستش شروع کر دیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اس کے اپنے زمانہ میں ہوئی۔ مگر آپ پر ایمان لانے کے بجائے وہ آپ کے خلاف حسد کرنے لگا۔ اس نے کہا: "مجھے امید تھی کہ نبوت مجھے ملے گی"۔ اس کے بعد وہ لوگوں کو آپ کے خلاف اکسانے لگا۔ غزوۂ بدر میں جو مخالفین اسلام قتل ہوئے تھے، ان کا مرثیہ لکھ کر لوگوں کو بھڑکاتا رہا۔ جب اپنی تخریبی کوششوں میں اسے کامیابی ہوتی نظر نہ آئی تو وہ اپنی بیٹی کو لے کر یمن کی آخری حدود کی طرف چلا گیا۔ وہاں سے پھر طائف آیا اور وہیں مر گیا۔ آخر وقت میں اس کی زبان پر یہ اشعار تھے:

کل عیش وان تطاول دھرا	منتھی امرہ الی ان یزولا
لیتنی کنت قبل ماقد بدا لی	فی رؤس الجبال ارعی الوعولا
اجعل الموت نصب عینیک واحذر	غولۃ الدھر ان للدھر غولا

زندگی خواہ کتنی ہی لمبی ہو۔ اس کا انجام بہرحال زوال ہے۔

کاش اس حالت کے رونما ہونے سے پہلے میں پہاڑوں کی چوٹیوں میں ہوتا اور وہاں پہاڑی بکریوں کو چرایا کرتا۔

تو موت کو اپنا نصب العین بنا اور زمانہ کی آفتوں سے ڈرتا رہ کیونکہ زمانہ اچانک پکڑ لیتا ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک بار اس کے کچھ اشعار سنائے گئے جس میں توحید کے مضامین تھے، ان کو سن کر آپ نے فرمایا:
"اس کی زبان مومن تھی اور اس کا دل کافر"

کیا آپ الرسالہ کے خریدار ہیں

اگر نہیں تو فوراً سالانہ خریداری کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ فرمائیے۔ تاکہ آپ دین حق کو زندہ کرنے کی اس تاریخی مہم میں شریک ہو سکیں جو اس ماہنامہ کے ذریعہ شروع کی گئی ہے۔

زر تعاون سالانہ: عمومی ۲۴ روپے

خصوصی کم از کم ایک سو ایک روپیہ

الرسالہ جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ۔ دہلی ۶

بائبل کی زبان میں

تم نے بہت امید رکھی مگر تم کو تھوڑا ملا

بنی اسرائیل کے نبی حجی، جن کا زمانہ چھٹی صدی قبل مسیح ہے، کی ایک کتاب موجودہ عہد نامہ قدیم میں شامل ہے، وہ اپنی قوم کو تنبیہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"تم نے بہت سا بویا پر تھوڑا کاٹا۔ تم کھاتے ہو پر آسودہ نہیں ہوتے۔ تم پیتے ہو پر پیاس نہیں بجھتی۔ تم کپڑے پہنتے ہو پر گرم نہیں ہوتے۔ اور مزدور اپنی مزدوری سوراخ دار تھیلی میں جمع کرتا ہے۔ رب الافواج فرماتا ہے کہ اپنی روش پر غور کرو۔ تم نے بہت امید رکھی اور دیکھو تھوڑا ملا۔ اور جب تم اسے اپنے گھر میں لائے تو میں نے اسے اڑا دیا۔"

"رب الافواج فرماتا ہے کیوں۔ اس لئے کہ میرا گھر ویران ہے۔ اور تم میں سے ہر ایک اپنے گھر کو دوڑا چلا جاتا ہے۔ یہ لوگ کہتے ہیں ابھی خداوند کے گھر کی تعمیر کا وقت نہیں آیا۔ تب خداوند کا کلام حجی نبی کی معرفت پہنچا کہ کیا تمھارے لئے مسقف گھروں میں رہنے کا وقت ہے جب کہ یہ گھر ویران پڑا ہے۔ اب رب الافواج یوں فرماتا ہے کہ تم اپنی روش پر غور کرو۔"

اعتدال سے ہٹنے کے بعد

نظّام ایک معتزلی تھا۔ معتزلہ کے عقیدہ کے مطابق اس کا کہنا تھا کہ "گناہ کبیرہ کا مرتکب ہمیشہ جہنم میں جلے گا"۔ اور چونکہ شراب پینا گناہ کبیرہ میں سے ہے۔۔ اس لئے شراب پینے والا ہمیشہ جہنم میں جلے گا۔ ابونواس نے اپنے ایک قصیدہ میں اس کا جواب دیتے ہوئے کہا:

فقل لمن یدّعی فی العلم فلسفۃً

حفظت شیئاً وغابت عنک اشیاءُ

اس شخص سے کہہ دو جو فلسفہ کا دعوے دار ہے کہ تم نے ایک چیز یاد کر لی ہے اور بہت سی چیزیں تم سے اوجھل ہیں۔

اصل یہ ہے کہ معتزلہ نے جنت اور جہنم کے اثبات کے لئے اشیاء کے لازمی خواص سے استدلال کیا۔ انھوں نے کہا جس طرح آگ کا نتیجہ گرمی ہے اور برف کا نتیجہ ٹھنڈک۔ اسی طرح اعمال کے بھی لازمی نتائج ہوتے ہیں۔ یہ بات ایک حد تک صحیح تھی۔ مگر وہ اس کو آخری حدود تک لے گئے۔ یہاں تک کہ گناہ کبیرہ کا خاصہ ان کے نزدیک اتنا قطعی بن گیا کہ ارتکاب جرم کے بعد کبھی وہ اس سے الگ نہیں ہو سکتا تھا۔

معتزلہ کی غلطی یہ تھی کہ وہ بھول گئے کہ یہاں اسباب و علل کے درمیان خدا کی ذات بھی ہے۔ وہ بندہ کی شرمساری کو پسند کرتا ہے اور توبہ کو قبول فرماتا ہے حتیٰ کہ وہ کسی بندہ کو اس طرح پاک کر دیتا ہے گویا اس سے گناہ ہی سرزد نہ ہوا ہو۔ بلکہ اس سے آگے بڑھ کر، وہ اپنے بعض بندوں کے لئے ان کے گناہ کو بھی ثواب کے خانہ میں لکھ دیتا ہے: اُولٰئِکَ یُبَدِّلُ اللّٰہُ سَیِّئَاتِہِمْ حَسَنَاتٍ۔ (فرقان ۷۰)

اصل کام خلود فی النار والوں کو خلود فی الجنۃ کے دائرہ میں لانا ہے

میں ایک ناخواندہ قسم کا آدمی ہوں، ڈگری بھی بی۔اے کی ہے وہ بھی انگریزی کی نہیں اردو کی (جامعہ ملیہ دہلی کی!) عربی فارسی میں بھی مبتدی ہوں۔ واقعۃً غبی اس درجہ کا ہوں کہ تیس برس حجاز مقدس میں ہوگئے، نہ اچھی طرح عربی بول سکتا ہوں نہ لکھ سکتا ہوں، نہ غیر کی امداد کے سوا پوری طرح سمجھ سکتا ہوں۔ یہ تو ہوئی تعلیمی حالت، اخلاقی کمال کا یہ حال ہے کہ ایک ایسے گناہ کا مرتکب ہوں جو نہ بیان ہوسکتا ہے نہ اس کا کوئی مداوا ہے۔ اسلام نہیں پوری انسانیت کا مجرم ہوں، نہ بھٹو کی کوئی حقیقت ہے میرے سامنے، نہ حجاج بن یوسف کی۔ لیکن یہ سب وہ باتیں ہیں کہ کسی کو میری بات پر کان نہیں دھرنا چاہئے، لیکن کہنے پر مجبور ہوں

۱۔ ہماری قوم ایک آوارہ قوم ہے اور اسی لئے ناکارہ ــــ آوارہ کیوں ہے؟ اس لئے کہ اس کا کوئی مقصد نہیں!

۲ عارضی طور پر کوئی مقصد کسی خطۂ ارضی یا قطعۂ ملّی کا بن گیا، بن گیا۔ ورنہ ملّی طور پر انفرادی اغراض اور بے مقصدی ہمارا مقصد ہے۔

۳۔ کیا واقعی ہم بے مقصد پیدا کئے گئے ہیں، بے فائدہ، عبث؟

۴۔ نہیں مقصد ہے، خوشنودئ خدا اور رضائے الٰہی، والدّخول فی الجنّۃ!

۵۔ مگر ان چیزوں کا تعلق آخرت کے ساتھ ہے، دونوں غیر مرئی اور غیر محسوس ہیں۔

۶۔ دنیا میں ظاہری مقصود: عبادت واطاعت، مگر اُمم سابقہ کے لئے!

۷۔ ہمارے لئے ساری اصطلاحی عبادات ذریعہ ہیں، مقصود نہیں، ہاں سب سے بڑی عبادت عبدیّت کی دعوت۔ وہ ہمارا مقصود قرار دیا گیا۔ اخرجت للناس (للمسلمین نہیں)۔

۸۔ اخرجت للنّاس۔ یعنی۔ لِاخراج النّاس مِنَ الظُّلُمٰاتِ اِلَی النُّور۔ مِنَ النّارِ اِلَی الجَنَّۃِ مِنَ الکُفرِ اِلَی الاِسلَام

۹۔ یہ مرئی اور محسوس بھی، اس کی چیکنگ (CHECKING) بھی ہوسکتی ہے، محاسبہ بھی ہوسکتا ہے۔

۱۰۔ یہ ہر شخص کا مقصد ہے، مقصد حیات۔ عملاً ایسا فریضہ جیسے نماز، ہر صغیر وکبیر پر واجب۔ ہر حال میں ہر جگہ، مرد وزن، صحیح ومعذور سب برابر۔ اس میں وہ رخصت بھی نہیں جو نماز کے لئے عورت کو، اور زکوٰۃ کے لئے غلام کو مل جاتی ہے۔

۱۱۔ ہاں "وَلْتَکُنْ مِّنْکُمْ اُمَّۃٌ" کی بنا پر ایک مستقل طائفہ بھی اس کے لئے مقرر یا منتخب ہوسکتا ہے۔ مگر اس طرح کہ ہر شخص مالی اور جانی طور پر اس کے ساتھ اس طرح مربوط وموثوق ہو کہ کسی حال میں اپنے آپ کو قلبی طور پر اس سے جُدا نہ پاسکے۔ مگر کام یہی ہو کہ: "خُلُود فِی النَّار" والوں کو: "خُلُود فِی الْجَنَّۃ" کے دائرے میں لانا ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہی کام تھا، ساری عمر اسی کو انجام

دیتے رہے۔

١٢۔ ہم کو ایک ہزار سال دیئے گئے، سارا ملک مسلمان ہو سکتا تھا، نہیں اٹھے حکومت ضبط کر لی گئی، ذلیل و خوار ہوئے، لاکھوں نذرِ اجل ہوئے، پھر شراب خور کی نہیں، پیشاب خور کی غلامی میں ڈال دیے گئے۔ ہزار سال میں سارا ملک مسلمان ہو سکتا تھا۔

١٣۔ اسپین میں چھ سو سال دیئے گئے، قوت و سطوت اور علم و فن کے ساتھ، نہیں اٹھے، سمندر میں ڈبو دیئے گئے۔ اگر سارا نہیں تو آدھا یورپ تو مسلمان ہو سکتا تھا۔

١٤۔ خلافتِ عثمانیہ کو سات سو سال دیئے گئے، اسلام کہاں سے کہاں پہنچتا۔ یورپ نہیں امریکہ بھی مسلمان ہو سکتا تھا، سلطنت مٹ گئی، خود ہی برباد ہو گئی۔ آج سارے عالم کی باگ ڈور کفر کے ہاتھ میں ہے، جیسا چاہتے ہیں نچاتے ہیں۔ یہ سب ترکِ دعوت کا نتیجہ ہے۔

١٥۔ قادیانی اور کچھ نہیں، یہ تو ضرور بتا گیا کہ دعوت دو تو آج بھی لاکھوں مسلمان ہو سکتے ہیں، اور غلط اسلام اس طرح پھیل سکتا ہے تو صحیح اسلام تو کس تیزی سے جائے گا، بلکہ اُن کے ہاں اس کا بھی جواب ہے کہ جب تک مسلمان خود کامل مسلمان نہیں بن جائیں گے، وہ دعوت کے ناقابل ہیں۔

١٦۔ تاریخ اسلام میں ہزاروں نہیں لاکھوں ہی عالم پیدا ہوئے، خدا معلوم کیا قصہ ہے، ہر ایک نے اس کو شجرِ ممنوعہ ہی سمجھا، چاروں طرف سے گھر گئے تو مدافعت تو ضرور فرمائی، مگر ہجوم کو کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھا۔

١٧۔ غزالیؒ، رومیؒ، سب اصلاحِ نفس اور اصلاحِ مسلمین میں لگے رہے۔ کسی نے اس ضرورت کو ضرورت، فریضہ کو فریضہ، مقصد کو مقصد نہیں گردانا۔

١٨۔ یہودیوں کا ایک مقصد ہے، دو ہزار برس بعد اس کو پا ہی لیا۔ ساری قوم لگی اور ہر دور میں لگی رہی، مسلمانوں کی بیخ کنی اور ہیکلِ سلیمانی کی واپسی۔

١٩۔ عیسائیت کا ایک مقصد ہے۔ ہر دم، ہر لمحہ، ہر وقت اس میں مشغولی۔ مشن (مقصد) کیا چیز ہے، نام سے ظاہر ہے۔ ساری قوم کا مقصد، غلام اور بادشاہ دونوں کا مقصد (مشنری) مقصد زندگی ہر وقت نظر کے سامنے۔ اُن کی حکومت اور ان کا حاکم بھی اسی لئے ہوتا ہے۔ پوری قوم اسی میں لگی ہوئی ہے۔

٢٠۔ عیسائی دنیا کی مصنوعات میں چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی کوئی چیز ایسی نہیں ہوتی جو صلیب سے خالی ہو۔ یہ ان کی سب سے ادنیٰ خدمتِ دین ہے، اس طرح وہ دنیا کے ہر گھر میں عیسائیت کا شعار پہنچاتے ہیں، بلکہ گھروں کو ان نشانوں سے بھر دیتے ہیں۔ ہمارے شاہوں اور گداؤں دونوں کے گھر ان نشانوں سے آباد ہیں، مزین ہیں۔ خود حرمین شریفین کی جانمازوں اور قالینوں پر ہزاروں صلیبیں بنی ہوئی ہیں اور عمارتیں تو بنائی جاتی ہیں صلیب کی بنیاد پر۔!

٢١۔ کیا یہ نفس کا دھوکا نہیں ہے کہ پہلے اپنے آپ کو بنالیں، پھر دوسروں کو دعوت دیں گے؟ ہزار برس ہو گئے آج تک تو بنے نہیں۔ دس ہزار برس مزید درکار ہیں۔ (قادیانیوں کی مثال بھی اسی دھوکے کا جواب ہے!)

یہ سب ترکِ دعوت کا نتیجہ ہے

۲۲۔ تحریکِ خلافت میرے بچپن اور لڑکپن کی چیز ہے، جلسوں میں نظمیں پڑھتے تھے۔ عورتوں کے مجمع میں جاکر چندہ جمع کرتے تھے۔ اس وقت تو کبھی خیال بھی نہیں آیا، اب سوچتا ہوں تو حیرت ہوتی ہے، ہم جھولیاں بھر بھر کرلاتے تھے اور کبھی ایک چھلا اس میں سے لینے کا خیال نہیں پیدا ہوا، مقصدِ عالی اخلاق کو خود بنا دیتا ہے۔ ہزاروں، لاکھوں بلکہ کروڑوں انسان یکایک بن گئے تھے۔ جامعہ ملّیہ بھی اس کا ایک مظہر تھی۔ قرآن کی تلاوتیں اور تہجد کی نمازیں ایک فیشن بن گئی تھیں۔

۲۳۔ مقصدِ مشترک کے لئے جب متحد ہوتے ہیں (اور مقصدِ مشترک خود ہی متحد کر دیتا ہے!) تو آپس کے اختلاف دب جاتے ہیں، کام مسلسل ہو تو فنا بھی ہو سکتے ہیں۔ یہی ہم نے خلافت میں دیکھا، یہی آپ متحدہ محاذ میں دیکھ رہے ہیں۔

۲۴۔ ہمارے ہاں سیکڑوں فرقے پیدا ہی اس لئے ہوئے کہ ملت کے سامنے کوئی مشترک مقصد نہیں تھا۔ آج مقصد کی تڑپ پیدا ہو جائے، ساری حماقتیں ختم ہو جائیں گی۔

یہ ایک مکتوب ہے جس کو میثاق (لاہور) بابت مارچ۔ اپریل ۱۹۷۸ سے یہاں نقل کیا گیا ہے، مکتوب نگار کا نام و پتہ یہ ہے:
عبدالقیوم (عبدالملک)
ص۔ب ۲۷۴، مدینہ منورہ
۲۰ جنوری ۱۹۷۸

موجودہ صدی کے ربع اول کے آخر میں خلافت تحریک اٹھی اور سارے ملک میں طوفان کی طرح پھیل گئی۔ یہ تحریک اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے سیاسی تھی۔ مگر تحریک نے جو نعرے اور دلائل استعمال کئے وہ سب مذہبی تھے۔ چنانچہ جو لوگ اس تحریک سے متاثر ہوئے ان میں مذہبیت اتنے زور شور کے ساتھ پیدا ہوئی کہ "قرآن کی تلاوتیں اور تہجد کی نمازیں بھی عام فیشن بن گئیں"

یہ مثال بتاتی ہے کہ کس طرح ایک سیاسی تحریک بھی مذہبی اخلاقیات پیدا کر دیتی ہے۔ اگرچہ اس قسم کی اخلاقیات کی کوئی اسلامی قیمت نہیں۔ اسلامی قیمت صرف ان اخلاقیات کی ہے جو جہنم کے شعلوں کو دیکھ کر آدمی کے اندر ابھری ہو نہ کہ سیاسی مسائل کو دیکھ کر —— دنیا کے لحاظ سے ان اخلاقیات کی اہمیت ہے جو دیرپا ہوں اور آخرت کے لحاظ سے وہ اخلاقیات اہمیت رکھتی ہیں جو خدا کے سامنے جوابدہی کے احساس سے ابھری ہوں۔ مگر ہنگامی تحریکوں میں دونوں میں سے کوئی قدر بھی موجود نہیں ہوتی۔

ایک عبرت انگیز واقعہ

قویلہ خاں (چنگیز خاں کا پوتا) ۶۵۵ھ میں چنگیز خاں کے تخت حکومت پر بیٹھا۔ یہ حکومت اس وقت چین سے لے کر یورپ تک پھیلی ہوئی تھی۔ اسلامی سلطنت بہت ضعیف حالت میں تھی۔ عیسائی، مجوسی اور یہودی مغلوں کے دربار میں رسوخ حاصل کر کے اسلام اور مسلمانوں سے ان کو متنفر کرنے کی کوشش میں مصروف تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ اباقا خاں ابن ہلاکو خان نے خراسان سے قویلہ خاں کی خدمت میں پیغام بھیجا کہ مجھ کو یہودیوں اور مجوسیوں نے بتایا ہے کہ مسلمانوں کی کتاب قرآن میں لکھا ہے کہ مشرکوں کو جہاں پاؤ قتل کرو، آپ کا اس تعلیم کے متعلق کیا خیال ہے۔ اگر مسلمانوں کا عقیدہ یہ ہے کہ وہ ہم کو جہاں پائیں قتل کریں تو ایسی حالت میں مسلمانوں کی قوم کا دنیا میں باقی رہنا ہمارے لئے ایک مستقل اندیشہ کا باعث ہے۔ قویلہ خاں اسلام سے متاثر تھا چنانچہ اپنی حکومت میں اس نے ایک وزیر مسلمان بھی رکھا تھا جس کا نام امیر احمد بناکتی تھا۔ اباقا خاں کی اس عرضداشت کو پڑھ کر قویلہ خاں نے بعض مسلمان علمار کو بلایا اور پوچھا کہ کیا تمہارے قرآن میں ایسا حکم موجود ہے۔ انھوں نے کہا "ہاں یہ حکم قرآن میں ہے" قویلہ خاں نے کہا کہ پھر تم ہم کو قتل کیوں نہیں کرتے۔ انھوں نے جواب دیا کہ اس وقت ہم قوت نہیں رکھتے۔ جب قوت پائیں گے، تم کو قتل کردیں گے۔ قویلہ خاں نے کہا کہ اب چونکہ ہم قدرت رکھتے ہیں لہذا ہم کو چاہئے کہ ہم تمھیں قتل کریں۔ یہ کہکر اس نے ان علمار کو قتل کرادیا اور حکم جاری کیا کہ مسلمانوں کو جہاں پاؤ قتل کردو۔ یہ خبر مولانا بدر الدین بیہقی اور مولانا حمید الدین سمرقندی کو ملی تو وہ قویلہ خاں کے دربار میں گئے اور کہا کہ آپ نے مسلمانوں کے قتل عام کا حکم کیوں جاری کیا۔ قویلہ خاں نے کہا یہ بتاؤ "اقتلوا المشرکین" کا حکم جو تمھارے قرآن میں ہے، اس کا کیا مطلب ہے۔ دونوں عالموں نے کہا کہ عرب کے بت پرست جو مسلمانوں کے قتل پر ہمہ تن آمادہ تھے۔ ان کی نسبت خدا نے اپنے پیغمبر کو حکم دیا کہ اپنی حفاظت کے لئے ان کو قتل کرو۔ یہ حکم تمھارے لئے نہیں ہے کیونکہ تم تو خدا کی وحدانیت کے قائل ہو اور اپنے فرمان کے اوپر خدا کا نام ہمیشہ لکھتے ہو۔ یہ سن کر قویلہ خاں بہت خوش ہوا اور اسی وقت حکم صادر کیا کہ میرا پہلا حکم جو مسلمانوں کے قتل کی نسبت جاری ہوا اس کو منسوخ سمجھا جائے (۳۷۹ - ۸۰)

سطحی علم اور گہرے علم کا فرق اس واقعہ سے واضح ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس شخص کے پاس گہرا علم نہ ہو، اس کو چاہئے کہ چپ رہے۔ نہ کہ بے معنی باتیں بول کر غیر ضروری مسائل پیدا کرے۔

پیغمبر عربی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بعثت اس لئے ہوئی تھی کہ وہ انسان کو نظری اور عملی ہر اعتبار سے، وہ راستہ بتا دیں جس پر چل کر انسان، خواہ وہ فرد ہو یا جماعت، نصرت الٰہی کا استحقاق حاصل کرے اور اپنی دنیا و آخرت کو کامیاب بنائے۔ اسی معنی میں کہا گیا ہے:

خَيْرُ الْهَدْيِ هَدْيُ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ — سب سے بہتر طریقہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ ہے

وہ بادشاہ ہو کر بھی اعتراف کرنا جانتے تھے

معاویہ بن ابی سفیان (۶۰۵ - ۶۸۰ء) نے اپنی خلافت کے زمانہ میں جمعہ کا خطبہ دیا اور کہا:

ایھا الناس ان المال مالنا والفیٔ فیئنا۔ من شئنا اعطینا ومن شئنا منعنا

اے لوگو، ساری دولت ہماری دولت ہے اور سارا مالِ غنیمت ہمارا مال ہے۔ ہم جس کو چاہیں دیں اور جس کو چاہیں نہ دیں۔

کسی نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ جب دوسرا جمعہ آیا تو انھوں نے پھر یہی بات دہرائی۔ مگر کوئی نہ بولا۔ پھر جب تیسرا جمعہ آیا تو معاویہ نے پھر یہی بات کہی۔ اب ایک شخص کھڑا ہوا اور کہا:

کلا، انما المال مالنا والفیٔ فیئنا، من حال بیننا و بینہ حکمناہ الی اللہ باسیافنا

ہرگز نہیں۔ مال ہمارا ہے۔ مالِ غنیمت بھی ہمارا ہے۔ جو شخص ہمارے اور اس کے درمیان حائل ہوگا، ہم اپنی تلوار کے ذریعہ اس کا فیصلہ اللہ کے پاس لے جائیں گے۔

یہ سن کر معاویہ منبر سے اتر آئے۔ اس شخص کو بلوایا۔ جب اسے معاویہ کے پاس داخل کیا گیا تو لوگ کہنے لگے کہ یہ شخص مارا گیا۔ لیکن معاویہ نے دروازے کھول دیئے۔ لوگ اندر داخل ہوئے تو دیکھا کہ وہ شخص معاویہ کے ساتھ بیٹھا ہوا ہے۔ معاویہ نے کہا: اللہ اس شخص کو زندہ رکھے، اس نے مجھے زندہ کر دیا (ان ھذا احیانی احیاہ اللہ) میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ "میرے بعد کچھ امراء ایسے آئیں گے جو باتیں کہیں گے مگر ان کا جواب نہیں دیا جائے گا۔ ایسے لوگ آگ میں بندروں کی طرح داخل ہوں گے۔ میں نے ایک بات کہی تھی، کسی نے اس کی تردید نہ کی تو مجھے ڈر ہوا کہ میں ان امراء میں داخل نہ ہو جاؤں۔ میں نے دوبارہ وہی بات کہی پھر بھی کسی نے جواب نہ دیا۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ میں انھیں لوگوں میں سے ہوں۔ پھر میں نے تیسرے جمعہ میں وہی بات کہی تو یہ شخص کھڑا ہو گیا اور اس نے میری تردید کی۔ اللہ اسے زندہ رکھے۔ اس نے مجھے زندہ کر دیا۔ اب مجھے امید ہے کہ اللہ مجھے ایسے امراء کے زمرہ سے نکال دے گا۔ پھر معاویہ نے اس شخص کو انعام دیا۔

الذہبی: تاریخ الاسلام، جلد ۲، صفحہ ۳۲۱

بعض اوقات آدمی کا کام اتنا بلند ہو جاتا ہے کہ اعتقادی اختلافات اس کو قبول کرنے میں حارج نہیں ہوتے۔ مثال کے طور پر زمخشری (۴۶۷ - ۵۳۸ھ) معتزلی تھا اور ابن منظور (۶۳۰ - ۷۱۱ھ) شیعہ۔ مگر ان کی یہ حیثیت تفسیر کشاف اور لسان العرب کو عام اہلِ سنت کے درمیان مقبول بنانے میں حارج نہ ہو سکی۔ کیونکہ انھوں نے ایسی کتابیں تیار کیں جن کے مثل اس موضوع پر دوسری کوئی کتاب نہیں۔

نئی دہلی کی تیسری ورلڈ بک فیر (فروری ۱۹۷۸) کا ایک منظر۔ کتابوں کی قطار میں "کتاب سبز" دکھائی دے رہی ہے۔

BOOKS ON DISPLAY AT THE THIRD WORLD BOOK FAIR, NEW DELHI
THE GREEN BOOK (AL-KITAB-UL-AKHZAR) CAN BE SEEN IN THE SECOND

کتابوں کی عالمی نمائش

WORLD BOOK FAIR III
NEW DELHI
HALL OF NATIONS
PRAGATI MAIDAN

11-20 FEBRUARY 1978
DAILY 1-30 TO 8 P.M.
SUNDAYS 10-30 A.M. TO 8 P.M.

Inauguration by
SHRI B. D. JATTI, Vice-President of India on 11.2.1978 at 11-15 a.m.

Presided over by:
DR. P. C. CHUNDER, Union Minister of Education & Social Welfare.

ORGANISED BY NATIONAL BOOK TRUST INDIA

کتابوں کی بین اقوامی نمائش ہندوستان میں پہلی بار ۱۹۷۲ء میں نئی دہلی میں ہوئی۔ دوسری بار ۱۹۷۶ء میں۔ اور اب اس قسم کی تیسری نمائش ہمیشہ سے زیادہ بڑے پیمانہ پر جون ۱۹۷۸ء میں نئی دہلی میں ہوئی ہے۔ نئی دہلی اب بین اقوامی کتابی نمائش کے شہروں کے کلب کا ممبر ہو چکا ہے۔ ان شہروں میں فرینک فرٹ، لیپزگ، وارسا، بلگریڈ، قاہرہ، مانٹریل، سنگاپور، ٹوکیو، ماسکو وغیرہ شامل ہیں۔

نئی دہلی کی تیسری بین اقوامی کتابی نمائش میں ملکی اور غیر ملکی شرکا کی تعداد توقع سے زیادہ ہوگئی۔ چنانچہ پرگتی میدان میں ۴۰۰۰۰ مربع میٹر جگہ اس کے لئے مخصوص کرنی پڑی جو پچھلی دونوں نمائشوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہے۔ امریکہ، انگلستان، روس، مغربی جرمنی، مشرقی جرمنی، ہالینڈ، زیکوسلاویکیہ، بلگریڈ، ہنگری، رومانیا، سوئزرلینڈ، یوگوسلاویا، کینیا، زمبیا، غانا، سینیگال، عراق، مصر، کویت، بنگلہ دیش، پاکستان، سنگاپور، جاپان، انڈونیشیا، نیوزی لینڈ وغیرہ ۳۵ غیر ملکوں کے ۲۰۰ ناشرین نے اس موقع پر شرکت کی اور اس نمائش میں اپنا اسٹال لگایا۔ ہندوستان کے جن ناشرین نے اس میں شرکت کی، ان کی تعداد تقریباً ۴۰۰ ہے۔ ان کے علاوہ اقوام متحدہ اور متعدد دوسرے ملکوں نے اپنے اطلاعاتی دفاتر اس موقع پر قائم کئے۔

پرائیویٹ اداروں کے علاوہ ہندوستان کے مختلف مرکزی اور ریاستی اداروں نے نمائش میں اپنے اپنے اسٹال کھولے۔ تاہم تین بڑی عمارتوں اور ان کے درمیانی پارک میں پھیلی ہوئی اس وسیع نمائش میں سب سے زیادہ غلبہ انگریزی کتابوں کا رہا۔ دوسرے نمبر پر ہندی کتابیں تھیں۔ اور اس کے بعد اردو اور دوسری علاقائی زبانوں کی کتابیں نیز غیر ملکی زبانوں کی کتابیں مثلاً روسی، جرمن، جاپانی، عربی، فارسی وغیرہ۔

اس موقع پر کتابوں کی نمائش کے علاوہ دوسری معاون تقریبات کا پروگرام بھی رکھا گیا۔ مثلاً کتابوں کی اشاعت کے مختلف پہلوؤں پر سیمینار، ایک چار روزہ بین اقوامی سیمینار بھی ہوا جس میں دنیا کے مختلف حصوں کے ماہرین نے تعلیمی مطبوعات کے بارے میں بحث و مباحثہ کیا۔ اسی طرح نمائش کے دوران متعدد دوسرے پروگرام ہوتے رہے۔ مثلاً فیڈریشن آف انڈین پبلشرس کی طرف سے ریفریشر کورس، فیڈریشن آف پبلشرس اینڈ بک سیلرس ایسوسی ایشن کی طرف سے بین اقوامی کتابی صنعت پر لکچر اور ٹریننگ کورس اور مصنفین کا کنونشن وغیرہ

عرب ۔ اسرائیل

اردن کے شاہ عبداللہ کو ۱۹۵۱ میں مسجد اقصیٰ (یروشلم) میں قتل کر دیا گیا تھا۔ ان کو قتل کرنے والا ایک فلسطینی انتہا پسند تھا۔ ۲۰ نومبر ۱۹۷۷ کو مصر کے صدر انور السادات نے مسجد اقصیٰ میں نماز ادا کی۔ اور صحیح وسالم قاہرہ واپس آ گئے۔ اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ ۲۶ سال پہلے مسجد اقصیٰ کی زمین پر مسلمانوں کا غلبہ تھا۔ آج وہاں یہودی قابض ہو چکے ہیں۔ فلسطین کی بازیابی کے بارے میں عربوں نے اور ساری دنیا کے مسلمانوں نے جو پالیسی اختیار کی، اگر اس میں انھیں خدا کی مدد حاصل ہوتی تو ناممکن تھا کہ آغاز تحریک میں جہاں وہ تھے اس سے آج اتنا زیادہ پیچھے چلے جاتے۔

اسرائیل کے بارے میں عربوں اور ساری دنیا کے مسلمانوں کی پالیسی اب تک یہ رہی ہے کہ اس کے وجود کو سرے سے تسلیم نہ کیا جائے۔ مصر کے سابق صدر جمال عبدالناصر نے اسی موقف کو بھدے الفاظ میں اس طرح ادا کیا تھا:

نحن ابناء الفراعنة سنرميكم في البحر

ہم فرعونوں کی اولاد ہیں۔ ہم تم کو سمندر میں دھکیل دیں گے۔

مگر آج مصر اور دوسرے مسلم ممالک اس کو تسلیم کرنے کے لئے اپنے کو راضی کر چکے ہیں، صرف اس شرط پر کہ اسرائیل اپنے بعد کے مقبوضات عربوں کو واپس کر دے! الٹی سمت میں یہ کامیاب سفر بھی عجیب ہے۔

آپ بیتی

جون ۱۹۶۵ کا واقعہ ہے۔ میں نینی تال کے ایک اسکول میں فزکس کا استاد تھا۔ ایک لڑکا میرے پاس ٹیوشن کے طور پر پڑھنے آتا تھا۔ اس کا نام وزیر سنگھ تھا۔ عمر تقریباً سترہ سال تھی۔ ایک روز وہ کسی قدر دیر سے آیا۔ حال یہ تھا کہ قمیص پھٹی ہوئی، ہونٹوں سے خون جاری، بال بکھرے ہوئے۔ اس کا یہ حلیہ دیکھ کر میں نے خیریت دریافت کی۔

اس نے بتایا کہ وہ آ رہا تھا کہ راستہ میں ایک مقام پر ایک رکشہ والے سے اس کا ٹکراؤ ہو گیا۔ اس کے بعد لڑکے میں اور رکشے والے میں تو تو میں میں ہوئی اور دونوں لڑ گئے۔ رکشے والا سردار تھا اور اپنے روایتی حلیہ میں تھا۔ مگر لڑکا بے داڑھی مونچھ اور بغیر پگڑی تھا۔ بظاہر یہ معلوم نہیں ہوتا تھا کہ وہ سردار ہے۔

لڑائی میں رکشے والے نے لڑکے کو پٹک دیا۔ اور مارنے لگا۔ اتنے میں لڑکے نے پنجابی زبان میں رکشے والے کو برا بھلا کہا۔ یہ سن کر رکشے والا ٹھٹھک گیا۔ اس نے پوچھا:

"تم کون ہو، تمھارا نام کیا ہے"

"وزیر سنگھ"

"کیا تم سردار ہو"

"ہاں"

اس کے بعد رکشے والا فوراً اٹھ گیا۔ "پہلے کیوں نہیں بتایا۔ سردار سردار کو نہیں مارتا" اس نے کہا اور دونوں گرد جھاڑتے ہوئے اپنے اپنے راستہ پر چلے گئے۔

سید حیدر علی ایم۔ ایس۔ سی (پیدائش ۱۹۴۴) دہلی

اپنے لاشعور کو پڑھیے

محمد جاوید اقبال بی۔ اے (پیدائش ۱۹۴۸) نگینہ ضلع بجنور کے رہنے والے ہیں۔ آج کل دہلی میں مقیم ہیں۔ ایمرجنسی کے دوران گرفتار ہوئے تھے۔ ان کو سنٹرل جیل (ناسک روڈ) میں رکھا گیا تھا۔ انھوں نے بتایا کہ جیل میں ان کے ساتھیوں میں سے ایک عبد الستار صاحب (پربھنی) تھے۔ ستمبر ۱۹۷۷ کی ایک مجلس میں انھوں نے یہ واقعہ بتایا۔

میری بھابی عرصہ سے بیمار رہتی تھیں۔ ان کو پیٹ کے عارضے تھے۔ بہت کمزور ہو گئی تھیں۔ مختلف حکیموں اور ڈاکٹروں کا علاج ہوتا رہا مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ بالآخر ہم نے تجویز کیا کہ موصوفہ کو کسی نفسیاتی ڈاکٹر کو دکھایا جائے۔ ہم ان کو حیدر آباد لے گئے اور وہاں ایک مشہور نفسیاتی ڈاکٹر کو دکھایا۔ ان کی فیس ۵۰۰ روپیہ تھی۔

ڈاکٹر نے مریضہ کو دیکھا۔ مختلف قسم کے سوالات کئے۔ مگر مرض کی جڑ معلوم نہ ہو سکی۔ اس کے بعد ڈاکٹر نے ایک انجکشن دیا۔ یہ بے ہوشی کا انجکشن تھا۔ مگر وہ آدمی کو پوری طرح بے ہوش نہیں کرتا۔ بلکہ نیم بے ہوشی کی حالت میں پہنچا دیتا تھا۔

نیم بے ہوشی کی کیفیت طاری کرنے کا مقصد یہ تھا کہ مریضہ کا شعور دب جائے اور لاشعور ابھر آئے۔ اب ڈاکٹر کے لئے ان کے لاشعور سے ربط قائم کرنا ممکن ہو گیا۔ ڈاکٹر نے موصوفہ سے سوال و جواب شروع کیا۔ نیم بے ہوشی کی وجہ سے مریضہ اب بھی سنتی تھی اور سوال کا جواب دیتی تھی۔ مگر یہ جواب اس کے لاشعور سے آتا تھا نہ کہ شعور سے۔

ڈاکٹر سوال و جواب کے ذریعہ موصوفہ کے لاشعور کو کریدتا رہا۔ بالآخر معلوم ہوا کہ اصل بات یہ ہے کہ موصوفہ کے بچے جب چھوٹے تھے تو ان کو اندیشہ لاحق ہو گیا کہ اگر میں مر گئی تو میرے بچوں کا کیا ہوگا۔ وہ برباد ہو جائیں گے۔ یہ اندیشہ عرصہ تک موصوفہ کو پریشان کرتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ ان کے لاشعور کا جزء بن گیا۔ لڑکے بڑے ہو گئے۔ ان میں سے کوئی لڑکا کام بھی کرنے لگا۔ اب بظاہر اندیشہ کی کوئی وجہ باقی نہیں تھی۔ حتیٰ کہ خود مریضہ نے بھی اس انداز سے سوچنا چھوڑ دیا۔ شعوری طور پر اب یہ سوال ان کے ذہن میں نہیں تھا کہ "میں مر جاؤں گی تو میرے بچوں کا کیا ہوگا"۔ مریضہ اب اپنے خیال میں بچوں کے مستقبل کی طرف سے مطمئن تھی۔ مگر ان کی بیماری بدستور جاری تھی۔

ڈاکٹر نے موصوفہ کے لاشعور سے ربط قائم کرنے کے بعد اندازہ کیا کہ بچوں کے مستقبل کا اندیشہ اگرچہ اب ان کے شعوری ذہن میں موجود نہیں ہے، مگر وہ ان کے لاشعور کا جزء بن کر اب بھی پوری طرح باقی ہے اور وہی در اصل ان کی بیماری کا سبب ہے۔

اس تشخیص کے بعد علاج آسان تھا۔ نیم بیہوشی کی حالت میں ڈاکٹر نے موصوفہ سے جو گفتگو کی، اس میں اس نے ان کے لاشعور میں یہ خیال ڈالا کہ وہ بالکل تندرست ہیں اور وہ مرنے والی نہیں ہیں۔ ان کے بچوں کے لئے کسی قسم کا کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ ہوش میں آنے کے چند دن بعد موصوفہ کی حالت میں

نمایاں فرق تھا۔ چند مہینوں کے وقفہ سے یہ عمل تین بار کیا گیا۔ ہر بار موصوفہ کو نیم بے ہوش کر کے ڈاکٹر ان کے لاشعور میں یہ خیالات ڈالتا کہ وہ بالکل تندرست ہیں اور ہرگز مرنے والی نہیں ہیں۔ ان کے بچوں کے لئے کسی قسم کے اندیشہ کا کوئی سوال نہیں ہے۔ تیسری بار مریضہ بالکل اچھی ہو چکی تھیں۔

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ لاشعور کس طرح آدمی کے اوپر اثر انداز ہوتا رہتا ہے جدید نفسیات نے ثابت کیا ہے کہ آدمی کا بیشتر عمل اس کے لاشعور کے زیر اثر واقع ہوتا ہے۔ ہماری محبت اور نفرت، ہمارا اتفاق اور اختلاف، ہماری تعریف اور تنقید، ہماری رائیں اور فیصلے، زیادہ تر لاشعور سے صادر ہوتے ہیں۔ ان میں بہت کم حصہ ہمارے شعور کا ہوتا ہے۔ کوئی شخص جب ایک چیز کو قبول اور دوسری چیز کو رد کر دیتا ہے تو بظاہر اس لئے کرتا ہے کہ ایک چیز اس کو ٹھیک معلوم ہوئی اور دوسری غلط نظر آئی۔ مگر اصل بات یہ ہے کہ یہ بڑی حد تک اس کے لاشعور کا کرشمہ ہوتا ہے۔ برسہا برس سے وہ جس قسم کے افکار و خیالات کو اپنے ذہن میں جگہ دے رہا تھا، وہ سب اس کے لاشعور میں جمع ہو رہے تھے، یہاں تک کہ انھوں نے اس کے لاشعور کو ایک خاص نہج پر ڈال دیا۔ اب جو چیز اس کے سامنے آتی ہے وہ خالص ذاتی وصف کی بنیاد پر اس کا جائزہ نہیں لے پاتا۔ اس کے لاشعور میں جو مزاج بنا ہوا ہے وہ اندر اندر اپنا کام کر کے آدمی کی رائے قائم کرنے کی قوت کو ایک سمت میں موڑ دیتا ہے۔

اس کا تجربہ نہایت آسانی سے اس طرح کیا جا سکتا ہے کہ کسی شخص کے سامنے دو ایسے آدمیوں کا معاملہ پیش کیا جائے جن میں سے ایک ان کا پسندیدہ شخص ہو اور دوسرے کو وہ ناپسند کرتا ہو۔ بالکل ایک درجہ کی غلطی کو دونوں کی طرف منسوب کیا جائے۔ اپنے مبغوض شخص کی غلطی فوراً اس کی سمجھ میں آجائے گی۔ وہ اس پر شدید ردعمل کا اظہار کرے گا۔ اس کے برعکس اپنی پسندیدہ شخصیت کے بارے میں وہ ٹھیک اسی درجہ کی غلطی کی تاویل کرے گا۔ اس کا غلطی ہونا اس کو نظر ہی نہ آئے گا۔ ایسا کرتے ہوئے وہ آدمی پوری طرح مخلص ہوگا۔ ایسا نہیں ہوگا کہ وہ جان بوجھ کر دو متضاد رویے اختیار کر رہا ہو۔ اسے مطلق خبر نہیں ہوگی کہ وہ ایک ہی معاملہ میں دو متضاد رویے اختیار کر رہا ہے۔ کیونکہ وہ لاشعور کے تحت بول رہا ہوگا نہ کہ شعور کے تحت۔

مگر اس "انجان" غلطی کے لئے انسان کو معاف نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ آدمی کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے لاشعور کی رکھوالی کرے۔ وہ لاشعور کو غلط بننے سے روکے۔ تاہم لاشعور میں غلط باتوں کے داخلہ کو مکمل طور پر روکا نہیں جا سکتا۔ اس لئے آدمی کو یہ کرنا ہے کہ وہ خود فکری کی صلاحیت پیدا کرے۔ وہ خود اپنے خلاف سوچے۔ حتیٰ کہ اپنے لاشعور کو دیکھنے لگے۔ جب اس کا لاشعور کسی سے غلط قسم کی محبت اور کسی سے غلط قسم کی نفرت کا جذبہ ابھارے تو وہ جان لے کہ یہ داعیات کہاں سے آرہے ہیں۔

ہر وہ شخص جو یہ چاہتا ہو کہ آخرت میں اس کو رسوا نہ ہونا پڑے، اس کے لئے لازم ہے کہ وہ اپنے لاشعور سے باخبر ہونے کی کوشش کرے ✦✦

فرد کا جھکنا قوم کا سربلند ہونا ہے

لارڈ سالسبری (۱۸۳۰ - ۱۹۰۳) ملکہ وکٹوریہ کے زمانہ حکومت میں برطانیہ کے وزیر اعظم تھے۔ اس زمانہ میں کار کا رواج نہ تھا۔ وزیر اعظم سالسبری اپنی سائیکل پر سوار ہو کر جا رہے تھے۔ ایک مقام پر وہ سڑک کے غلط رخ سے گزرنے لگے۔ سڑک پر متعین کانسٹبل نے انھیں روکا۔ وزیر اعظم نے کانسٹبل کو بتایا کہ میں وزیر اعظم ہوں اور چوں کہ مجھے عجلت تھی اس لئے مجھ سے ٹریفک کے ضابطہ کی خلاف ورزی ہوگئی۔ کانسٹبل نے جواب دیا کہ میں اپنی ڈیوٹی کو بجالانے والا کانسٹبل ہوں۔ میرا فرض صرف یہ ہے کہ کہ ٹریفک کی خلاف ورزی نہ ہونے دوں۔ چوں کہ آپ ایک سفید ریش بزرگ ہیں اس لئے میں صرف اتنی رعایت کر سکتا ہوں کہ آپ کا چالان نہ کروں۔ لیکن اتنا آپ کو بہرحال کرنا پڑے گا کہ آپ واپس جائیں اور جہاں سے سڑک شروع ہوتی ہے وہاں سے سیدھی سمت میں آئیں۔ وزیر اعظم نے بے چون و چرا ٹریفک کانسٹبل کا حکم مان لیا۔ نیز اس واقعہ کا ذکر ملکہ وکٹوریہ کے پرائیویٹ سکریٹری سے خود کر کے اس فرض شناس کانسٹبل کو خراج تحسین پیش کیا۔

برطانیہ کے دوسرے وزیر اعظم مسٹر بالڈون (۱۸۶۷ - ۱۹۴۷) کا واقعہ ہے۔ وہ اپنی کار میں سفر کر رہے تھے۔ ایک چوراہہ پر کار رکی۔ ٹریفک کی قطار میں ان کی گاڑی پیچھے تھی۔ راستہ کھلا تو ڈرائیور نے قبل اس کے کہ آگے کی موٹریں گزریں، وزیر اعظم کی موٹر آگے نکال لینے کی کوشش کی۔ ٹریفک کانسٹبل نے فی الفور روکا۔ ڈرائیور نے کہا کہ وزیر اعظم صاحب کو سرکاری کام کی وجہ سے جلدی ہے۔ کانسٹبل نے کہا، مجھے اس سے کوئی بحث نہیں کہ موٹر نشین کون ہے۔ قانون کی رو سے ٹریفک کی پابندی عام شہری اور وزیر اعظم دونوں پر لازم ہے۔ یہ سن کر وزیر اعظم نے موٹر سے اتر کر کانسٹبل سے معافی مانگی اور ڈرائیور کو ہدایت کی کہ وہ کانسٹبل کے حکم کی تعمیل کرے۔

(نیشنل ہیرلڈ جنوری ۱۹۷۸)

لیڈر اپنے کو اصول کے آگے جھکالے تو ساری قوم اصول کے آگے جھکنے والی بن جاتی ہے اور یہی کسی قوم کی طاقت کا سب سے بڑا راز ہے

سیاست کا راز

ابو فراس حمدانی عباسی دور کا شاعر ہے۔ وہ اپنے ایک قصیدہ میں کہتا ہے :

اذا ما ارسل الامراء جیشا

الی الاعداء ارسلنا الکتابا

یعنی ہماری دھاک کا یہ عالم ہے کہ جہاں دوسرے امراء کو مقابلہ کرنے کے لئے لشکر بھیجنا پڑتا ہے، وہاں ہم صرف خط بھیج دیتے ہیں اور وہی فیصلہ کے لئے کافی ہو جاتا ہے۔

یہاں ایک شعر میں شاعر نے سیاست کا راز بتا دیا ہے، سیاست یہ نہیں ہے کہ حریف سے لڑائی بھڑائی جاری رکھی جائے۔ سیاست یہ ہے کہ اپنے آپ کو اتنا طاقت ور اور مستحکم بنا لیا جائے کہ جب ضرورت پڑے تو صرف ایک "تحریر" بھیج دینا معاملہ کو ختم کرنے کے لئے کافی ہو۔

رائے سے رجوع

سورۃ انعام آیت ۹ (وَلَلَبَسْنَا عَلَيْهِمْ مَا يَلْبِسُوْنَ) کی تفسیر میں ایک شاذ قول اس مفہوم کا ہے کہ "ہم ان کو وہی کپڑے پہناتے جو کپڑے یہ لوگ پہنتے ہیں"۔ راقم الحروف نے ایک سوال کے جواب میں اسی قول کو ترجیح دی تھی (الرسالہ اکتوبر ۱۹۷۶ دسمبر ۱۹۷۶)

مگر بعد کی تحقیق سے مجھ پر واضح ہوا کہ آیت کا یہ مفہوم درست نہیں ہے۔ درست مفہوم وہی ہے جس کو جمہور مفسرین نے لیا ہے۔ یعنی اس سے مراد اشتباہ و التباس ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالفین کا کہنا تھا کہ خدا کو اگر اپنا دین بھیجنا تھا تو فرشتہ کے ذریعہ کیوں نہ بھیجا۔ اس کے جواب میں قرآن میں کہا گیا کہ اگر ہم فرشتہ کے ذریعہ ہدایت بھیجتے تو اس کو بھی آدمی کی صورت میں بھیجتے تاکہ اشتباہ کا پہلو باقی رہے۔ انسان اس دنیا میں حالت امتحان میں ہے، اس لئے اعلان حق کا جو بھی ذریعہ اختیار کیا جائے، بہر حال حکمتِ امتحان کا تقاضا ہوگا کہ التباس و اشتباہ کا پردہ باقی رکھا جائے۔ حق کا اپنی عریاں شکل میں آنا دراصل مہلت امتحان کا ختم ہونا ہے۔ اس کے بعد انسان رب العالمین کے سامنے کھڑا کر دیا جاتا ہے، نہ کہ ظلم و فساد جاری رکھنے کے لئے اس کو زمین پر باقی رکھا جائے۔

فرشتہ اگر پیغامبر بن کر آئے تو سنت الٰہی کی بنا پر وہ بھی انسان کی شکل میں آئے گا، اور اس وقت یہ لوگ اس انسان نما فرشتہ کے باب میں بھی وہی اشکالات اور احتمالات اور وہی کج بحثیاں پیدا کریں گے اور وہی کٹھ حجتی نکالیں گے جو آج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کر رہے ہیں۔

اگلی آیت میں کہا گیا ہے: "اور تم سے پہلے بھی پیغمبروں کے ساتھ تمسخر کیا گیا ہے پھر ان لوگوں کو جو پیغمبروں کی ہنسی اڑاتے تھے، عذاب نے آگھیرا (انعام ۱۰)۔ قرآن میں بار بار اس کا ذکر کیا گیا ہے۔ بائبل میں بھی اس کی تفصیل موجود ہے۔ یہاں بائبل کا ایک اقتباس نقل کیا جاتا ہے:

"اور خداوند ان کے باپ دادا کے خدا نے اپنے پیغمبروں کو ان کے پاس بر وقت بھیج بھیج کر پیغام بھیجا۔ کیوں کہ اسے اپنے لوگوں اور اپنے مسکن پر ترس آتا تھا۔ لیکن انھوں نے خدا کے پیغمبروں کو ٹھٹھوں میں اڑایا اور اس کی باتوں کو ناچیز جانا۔ اور اس کے نبیوں کی ہنسی اڑائی۔ یہاں تک کہ خداوند کا غضب اپنے لوگوں پر ایسا بھڑکا کہ کوئی چارہ نہ رہا۔

(۲۔ تواریخ، ۳۶: ۱۶-۱۷)

التباس کا پردہ نہ ہوتا تو نبیوں کا یہ انجام نہیں ہو سکتا تھا۔

وحید الدین ۱۰ مارچ ۱۹۷۸

کسی نے اپنی دنیوی زندگی کو کامیاب بنا لیا ہو تو اکثر وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ اس کی آخرت بھی ضرور کامیاب رہے گی۔ حالاں کہ دونوں میں کوئی لازمی تعلق نہیں۔

ایک سفر

مارچ ۱۹۷۸ کا تیسرا ہفتہ میوات میں گزرا۔

اس سفر کا اصل مقصد یہ تھا کہ چند دن شہر سے دور کھلی فضا میں گزارے جائیں شہروں کی دنیا بڑی حد تک مصنوعی دنیا ہوتی ہے مگر جب آدمی آبادیوں سے دور کھلی فضا میں ہو تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ قدرت کے قریب پہنچ گیا ہے۔ وہ ایک ایسے آفاقی آئینہ کے سامنے ہے جہاں وہ خدا کو براہ راست دیکھ سکتا ہے۔

میں نیم کھیڑا (ضلع گوڑ گاؤں) کے باہر اوجینا ڈرین کے ٹیلے پر کھڑا تھا۔ آسمان کی وسعتیں، پہاڑوں کی بلندیاں، زمین کے قدرتی مناظر میری آنکھوں کے سامنے تھے۔ "انسانوں کی دنیا سے دور خدا کی دنیا کتنی حسین ہے"، میری زبان سے نکلا۔ خدا نے دو چیزوں میں اپنے آپ کو ظاہر کیا ہے۔ ایک، عالم کائنات (یدبر الامر) کی سطح پر۔ دوسرے، الہامی شریعت (یفصل الآیات) کی سطح پر۔ اول الذکر مقام پر وہ براہ راست اپنی مرضی کو نافذ کر رہا ہے۔ ثانی الذکر مقام پر وہ چاہتا ہے کہ انسان خدا کی مرضی کو جانے اور بطور خود اس کو اپنی زندگی میں نافذ کرے۔

"کیا خدا کی دونوں دنیاؤں میں تضاد ہے"، میرے دل نے کہا۔ "کیا تدبیر امر کی سطح پر خدا کچھ اور ہے اور تفصیل آیات کی سطح پر کچھ اور۔ بقیہ کائنات کو خدا انتہائی محکم قوانین کی بنیادوں پر چلا رہا ہے۔ مگر انسانوں سے اس کو مطلوب ہے کہ وہ خوابوں اور کراموں کی ایک پراسرار دنیا بنا کر اس کی طلسماتی فضا میں زندگی گزاریں۔ خدا کو شیشم یا چنار کا ایک درخت اگانا ہو تو وہ سو سال کا خاموش منصوبہ بناتا ہے۔ مگر اپنے بندوں سے وہ چاہتا ہے کہ نعروں اور تقریروں کا طوفان اٹھا کر آناً فاناً اپنے مستقبل کو بدل ڈالیں۔ ستاروں اور کہکشاؤں کی دنیا میں وہ ہر آن متحرک ہے۔ مگر مدرسوں اور خانقاہوں میں وہ جمود اور تقلید پر راضی ہو گیا ہے۔ پھولوں اور درختوں میں وہ خوش ذوقی کا دریا بہا رہا ہے۔ ہوا کے جھونکوں اور پانی کے جھرنوں میں وہ لطافت کا خزانہ بکھیر رہا ہے۔ آسمانوں کی وسعت اور پہاڑوں کی بلندی میں وہ خاموش عظمتوں کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ مگر انسانوں سے وہ چاہتا ہے کہ وہ گدھے اور کوے کی طرح چیخیں اور احتجاج اور مطالبات کی غوغا آرائی کریں۔ چہچہاتی ہوئی چڑیوں سے لے کر روشن ستاروں تک۔ ہری بھری گھاس سے لے کر نیلے آسمان تک ہر طرف انتہاہ حکمت و معنویت نظر آتی ہے۔ ہر جگہ انتہائی بامعنی سرگرمیاں جاری ہیں، مگر اپنے بندوں سے خدا ایسی عبادات پر راضی ہے جس میں کچھ رٹے ہوئے الفاظ کو زبان سے دہرا لینے سے بڑے بڑے مقامات طے ہوتے ہیں اور عالی شان جنتیں حاصل ہو جاتی ہیں"

حقیقت یہ ہے کہ جو دین آج مقررین اسلام اور مفکرین ملت ہر طرف تقسیم کر رہے ہیں، اس کو دین کہنا اس قرآن پر اتہام ہے جس کی عظمت کا یہ حال ہے کہ ویسا قرآن سارے جن و انس مل کر بھی تصنیف نہ کر سکیں۔ ایسا دین خدا کی اس عظیم و حسین کائنات کے اندر ایک مسخرہ پن کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ کائنات کی سطح پر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ خدا کی دنیا رنگ اور خوشبو بکھیرنے والے پھولوں اور پیار اور بے نفسی کا سبق دینے والی چڑیوں کے لئے ہے۔

مگر دین کے ٹھیکیدار آج جس دین کا مظاہرہ کر رہے ہیں، اس کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے گویا خدا کی جنت نکمے لوگوں کا کباڑ خانہ ہے یا مسخروں کی نمائش گاہ۔

یہ بات آج لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی۔ مگر جب صور پھونکا جائے گا اور ساری حقیقتیں کھل جائیں گی، اس وقت لوگ اس کو اپنی آنکھ سے دیکھ لیں گے۔ اگرچہ اس وقت کا دیکھنا کسی کے کام نہ آئے گا۔

یہاں چند مجلسوں میں وعظ و نصیحت کا موقع بھی ملا۔ زیادہ تر حدیثیں اور صحابہ کے واقعات سنائے گئے۔ ایک تقریر کا خلاصہ یہاں درج کیا جاتا ہے۔

جب مجھ کو کہیں تقریر کرنی ہوتی ہے تو ہمیشہ ایک سوال میرا پیچھا کرتا ہے "کیا بات ہے جو میں کہوں"۔ واقعہ یہ ہے کہ کوئی بات ایسی نہیں جو کہی نہ جا چکی ہو۔ عربی شاعر عنترہ کا ایک شعر ہے:

هل غادر الشعراء من متردم

کیا پچھلے شعراء نے کوئی پیوند لگانے کی جگہ باقی چھوڑی ہے جس کو ہم پورا کریں۔

دینی اور اخلاقی لحاظ سے یہ بات اور زیادہ صحیح ہے حقیقت یہ ہے کہ کہنے والے ساری بات کہہ چکے ہیں۔ پھر بھی ہم دیکھتے ہیں کہ سننے والوں کا قافلہ سننے سے پہلے جس راستہ پر چل رہا تھا، اسی راہ پر سننے کے بعد بھی چلا جا رہا ہے۔ گویا اصل مسئلہ کہنے کا نہیں ہے۔ اصل مسئلہ کہنے کو پکڑنے کا ہے۔ اور یہی وہ چیز ہے جس کے لئے کوئی تیار نہیں۔

میوات میں تین سو سال پہلے ایک صوفی شاعر گزرے ہیں۔ ان کے اشعار اکثر میواتیوں کو یاد ہیں۔ ان کا ایک شعر ہے:

پی پیارے کے دیس کی بڑی کٹھن ہے گیل
کوئی کوئی جائیگو بھیک جی سلجھا سلجھا بیل

میں سمجھتا ہوں کہ آدمی اگر پکڑے تو یہی ایک شعر اس کی اصلاح کے لئے کافی ہے۔ بھیک جی کہہ رہے ہیں کہ آخرت کا راستہ بڑا کٹھن ہے۔ یہ جھاڑیوں سے بھرا ہوا ہے۔ وہی شخص منزل پر پہنچے گا جو جھاڑیوں سے بچ بچ کر چلے جو اس قسم کا اہتمام نہیں کرے گا وہ راستے میں الجھ کر رہ جائے گا۔

میو لوگ کس حد تک اس پر عمل کر رہے ہیں، اس کے لئے میں یہیں کا ایک واقعہ سناتا ہوں۔ کل (۱۸ مارچ ۱۹۷۸) صبح دس بجے ہم گاؤں کے باہر تھے۔ وہاں سرکار کی طرف سے بند بنایا جا رہا ہے۔ سینکڑوں مرد، عورتیں مٹی ڈھونے میں لگے ہوئے ہیں۔ ایک عورت جو مٹی کا ٹوکرا اٹھائے ہوئے تھی، ایک مرد نے اس سے کہا کہ "یہاں مٹی ڈال"۔ اس پر عورت بگڑ گئی۔ "تو کون ہوتا ہے بتانے والا" اس نے کہا۔ پہلے لفظی تکرار ہوئی۔ اس کے بعد دونوں طرف سے لاٹھیاں آگئیں۔ کچھ لوگ مرد کی طرف سے اور کچھ عورت کی طرف سے جمع ہو گئے اور ایک دوسرے کے خون کے پیاسے بن کر ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑے۔

یہ سارے کے سارے مسلمان تھے۔ وہ خوب جانتے تھے کہ ایک مسلمان کے لئے دوسرے مسلمان کی جان، مال، آبرو حرام ہے۔ مگر جب ایک "جھاڑی" آگئی تو اس سے بچ کر نکلنے کے لئے وہ تیار نہ ہوئے۔ وہ جھاڑی سے الجھ گئے۔ وہ بھول گئے کہ اس طرح وہ اپنی آخرت کی منزل کو کھوٹا کر رہے ہیں۔

آپ لوگ داڑھی بھی رکھتے ہیں۔ نماز اور تسبیح بھی پڑھتے ہیں۔ مگر جہاں کوئی جھاڑی آئی، اس میں الجھ کر رہ جاتے ہیں۔ اس کی وجہ دراصل یہ ہے کہ خدا کا فکر دلوں میں پیدا نہیں ہوا۔ ہم نے آخرت کو اپنی منزل نہیں بنایا۔ ہاتھ میں تسبیح کیوں نہ ہو۔ عملاً سارے لوگ دنیا کی منزل کی طرف چلے جا رہے ہیں۔ صرف یہ ہے کہ کوئی "بے داڑھی" ہو کر اس طرف بھاگ رہا ہے، کوئی داڑھی اور تسبیح لئے ہوئے اس مقدس سفر میں مشغول ہے۔

مومن کا ہر مسئلہ آخرت کا مسئلہ ہے۔ مگر ہماری زندگی میں جب کوئی صورت پیش آتی ہے تو ہم فوراً اس کو دنیا کا مسئلہ بنا لیتے ہیں۔ مثلاً لڑکی کی شادی کو لیجئے۔ ایک میو کے گھر میں شادی کا معاملہ ہو تو خواہ کتنا ہی قرآن و حدیث سنایا جائے، وہ اسی طرح شادی کرے گا جس طرح عام دنیا پرست کرتا ہے۔ خواہ اس کی قیمت سودی قرض اور کھیت کا رہن ہی کیوں نہ ہو۔

کوئی شخص آپ کو سخت بات کہہ دے۔ کسی سے آپ کو تکلیف پہنچ جائے تو آپ چاہتے ہیں کہ اس کو مٹا ڈالیں۔ اس کی معاشیات کو تباہ کر دیں۔ اس کی عزت کو خاک میں ملا دیں۔ یہ سب اس لئے ہے کہ آدمی بھول جاتا ہے کہ اس کے اور اس کے فریق کے درمیان خدا کھڑا ہوا ہے جو سارے طاقت وروں سے زیادہ طاقت ور ہے۔ اگر معاملہ کا یہ پہلو ذہن میں ہو تو اپنے کسی بھائی کو ذلیل کرنے کا خیال مضحکہ خیز حد تک بے معنی معلوم ہو۔ کیوں کہ عزت اس کے لئے ہے جس کو خدا عزت دے اور ذلیل وہ ہے جو خدا کی نظر میں ذلیل قرار پائے۔

ہر کسان جانتا ہے کہ ٹونے ٹوٹکے سے کوئی کھیت اپنی فصل نہیں اگاتا۔ مگر خدا کی جنت جو تمام قیمتی چیزوں سے زیادہ قیمتی ہے، اس کے متعلق فرض کر لیا گیا ہے کہ وہ کچھ الفاظ زبان سے دہرا کر یا کچھ رسمی اعمال ادا کر کے مل جائے گی۔ یہ عظیم الشان بھول ہے۔ خدا کی پوری کتاب نطق کی زبان میں اور خدا کی ساری کائنات خاموشی کی زبان میں اس کا انکار کر رہی ہے۔

مومن وہ ہے جو ہر مسئلہ کو آخرت کا مسئلہ سمجھے، جو آخرت کی عزت و ذلت کو اہمیت دے نہ کہ دنیا کی عزت و ذلت کو۔

اسلامی تعلیم

اسلامی تعلیم ایک دو طرفہ منصوبہ ہے۔ اس کا ایک مقصد یہ ہے کہ مسلم نسلوں میں علم دین کا تسلسل باقی رکھا جائے۔ دوسرا مقصد یہ ہے کہ ہر دور کے اہلِ ایمان کو شعوری اعتبار سے اس قابل بنایا جائے کہ وہ اپنے زمانہ کے فکری مسئلوں پر دین کی معرفت حاصل کر سکیں۔ پہلے مقصد کے حصول کا دائمی ذریعہ قرآن اور اسوۂ رسول کی تعلیم ہے۔ مگر دوسرے مقصد کے لئے کوئی دائمی نصاب نہیں ہو سکتا۔ اس کا تعین اس دور کے علمی و ذہنی حالات سے ہوتا ہے جس دور کے لئے نصاب مقرر کرنا مقصود ہو۔

MODERNISERS IN RETREAT

Orthodoxy Sweeping Muslim World

موقع پرستی اور سطحیت کی زمین پر دین حق کا محل کھڑا نہیں ہو سکتا

پیرس سے فرانسیسی زبان کا ایک میگزین شائع ہوتا ہے جس کا نام ہے LE NOUVEL OBSERVATEUR ستمبر ۱۹۷۷ کے پہلے ہفتہ کی اشاعت میں اس میں مصر کے کچھ ادیبوں کا ایک مشترکہ مضمون چھپا ہے جس میں اس بات پر اظہار خیال کیا گیا ہے کہ حال میں کس طرح اکثر مسلم ملکوں میں "روایت پرست مذہبی طبقہ" اچانک ابھر آیا ہے۔ قریب میں جن لوگوں نے مسلم ملکوں کے سفر کئے ہیں یا جو مختلف مسلم ملکوں میں چھپنے والی تازہ کتابوں اور اخبارات و رسائل سے باخبر ہیں، وہ آج کل کثرت سے اس موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کر رہے ہیں۔ ٹائمس آف انڈیا کے شرق اوسط کے نمائندہ دلیپ پیڈ گاونکر نے اس سلسلہ میں ایک مفصل جائزہ شائع کیا ہے۔ (ٹائمس آف انڈیا ۱ ستمبر ۱۹۷۷)

دو سو برس پہلے جب مغربی طاقتیں مسلم دنیا پر چھا گئیں تو تمام مسلم ملکوں میں اسلام کے احیاء کی تحریکیں اٹھ کھڑی ہوئیں جو موجودہ صدی کے وسط تک جاری رہیں۔ اب دوبارہ، اگرچہ نسبتاً کم تر شدت کے ساتھ، تمام مسلم ملکوں میں اسلام کے نام پر سرگرمیاں ابھر آئی ہیں۔ پچھلی تحریکیں باہر کی نوآبادیاتی طاقتوں کے جواب میں اٹھی تھیں، موجودہ تحریکوں کا نشانہ خود اپنے ملکوں کا سیکولر اور جدت پسند طبقہ ہے۔ اس لحاظ سے موجودہ تحریکوں کا حریف ان کے پیش رو دُور کے مقابلہ میں بہت کمزور ہے۔ تاہم تقریباً یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ جس طرح نوآبادیاتی تسلط کے خلاف اٹھنے والی تحریکیں اپنے اصل مقصد (غلبۂ اسلام) میں مکمل طور پر ناکام رہیں، موجودہ تحریکیں بھی اپنے اصل مقصد (احیائے اسلام) میں قطعاً ناکام ثابت ہوں گی۔ وقتی ہنگاموں اور نمائشی فتوحات کے سوا خدا کے دین کو ان سے کچھ ملنے والا نہیں ہے۔

وجہ بالکل سادہ ہے۔ یہ تحریکیں حقیقۃً کسی الٰہیاتی جذبہ کے تحت نہیں اٹھی ہیں۔ یہ محض پٹرول کی دولت ہے جس نے اچانک انھیں زندگی دے دی ہے۔ روایتی ذہن اور روایتی علم رکھنے والے لوگ پچھلے سو سال سے اپنے ملکوں میں دبے ہوئے تھے۔ مسلم معاشرہ کے تمام اہم شعبوں پر مغربی تعلیم یافتہ اور جدت پسند لوگ قابض تھے۔ روایتی طبقہ نہ تو ان لوگوں کے زیر اثر قائم شدہ حکومتی شعبوں کو سنبھالنے کی اہلیت رکھتا تھا نہ ان کے انتظام کے تحت ہونے والے اجتماعات اور کانفرنسوں میں خطابت کا کمال دکھانے کی قوت اپنے اندر پاتا تھا۔

روایت پرست طبقہ مسلسل اس کوشش میں لگا ہوا تھا کہ ان کو زیر کر سکے اور تمام شعبوں کو ایسی سطح پر لائے جہاں اس کے لئے اپنی صلاحیتوں کے مطابق غالب کردار ادا کرنا ممکن ہو سکے۔ یہاں پٹرول کی دولت

کے مالکوں نے ان کی مدد کی۔ کیونکہ دونوں کا مفاد کم از کم جزدی طور پر، ایک ہو گیا تھا۔

پٹرول کی دولت جن ملکوں میں ظاہر ہوئی ہے، ان میں سے اکثر ملکوں میں شیوخ اور ملوک حکمراں ہیں۔ جدت پسند مسلمان، جن کا ذہن جمہوریت اور سوشلزم کے تصورات سے بنا ہے، وہ ان کو قبول نہیں کر رہے تھے۔ ان حکمرانوں کو مسلسل ان کی طرف سے جوابی انقلاب کا خطرہ لگا رہتا تھا۔ مصر، عراق، شام، لیبیا میں یہ گروہ ملوکیت کے ادارہ کو ختم کرنے میں کامیاب ہو چکا ہے۔ دوسرے ملکوں میں ان کی سرگرمیاں جاری ہیں۔ ایران کے بادشاہ کو مصدق نے معزول کرنے کی ناکام کوشش کی۔ جمال عبدالناصر نے سعودی عرب میں ملوکیت کے خلاف جنگ چھیڑ دی۔ کویت کا جدید تعلیم یافتہ طبقہ شیخ کویت کے اختیارات کو کم کر کے جمہوریت لانا چاہتا ہے۔

یہی صورت حال کم و بیش اکثر ممالک میں پائی جاتی ہے۔ ان حالات میں شیوخ و ملوک نے، دوسری حفاظتی کوششوں کے ساتھ، ایک تدبیر یہ اختیار کی ہے کہ نہ صرف اپنے ملکوں میں بلکہ ساری مسلم دنیا میں روایت پرست طبقہ کو ابھارا جائے۔ جدت پسند طبقہ کے زور کو گھٹایا جائے۔ اس طرح انھیں امید ہے کہ وہ اپنی پوزیشن کو مضبوط کر سکیں گے۔

ان حالات میں جو لوگ سیاسی اچھل کود کر رہے ہیں یا تقریر و تحریر کے کمالات دکھا رہے ہیں، وہ صرف موقع پرستی کا ثبوت دے رہے ہیں۔ اور عوام میں سے جو ان تماشوں پر خوش ہو رہے ہیں، وہ سطحیت کا مظاہرہ کر رہے ہیں اور یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ موقع پرستی اور سطحیت کی زمین پر دین حق کا محل کھڑا ہو جائے۔ کم از کم موجودہ دنیا میں اس قسم کا واقعہ ظہور میں نہیں آسکتا۔ ایسے معجزات دکھانے کے لئے ہمیں دوسرے زمین و آسمان بنانے پڑیں گے۔

* * * * * * * * * * * * * * * * * * * *

خارجی ختم ہو گئے

خارجیت زندہ ہے

ایک بار خارجی فرقہ کے چالیس آدمیوں نے ابن زیاد کے دو ہزار سپاہیوں کو مار بھگایا تھا۔ اس پر ایک خارجی شاعر نے فاتحانہ نظم لکھی۔ چند اشعار یہ ہیں:

أألفا مومن فيما زعمتم
ويقتلكم بآسك اربعونا
كذبتم ليس ذاك كما زعمتم
ولكن الخوارج مومنونا
هي الفئة القليلة قد علمتم
على الفئة الكثيرة ينصرونا

کیا تم اپنے گمان کے مطابق دو ہزار مومن تھے اور تم کو مقام آسک پر صرف چالیس نے مار بھگایا، تم جھوٹے ہو اور تمھارا خیال غلط ہے، درحقیقت خوارج مومن ہیں، تم نے جان لیا کہ یہی وہ تھوڑی جماعت ہے جو بڑی جماعت پر غالب آتی ہے۔

خارجی شاعر کی اس دلیل کو آج کوئی بھی تسلیم نہیں کرے گا۔ مگر حیرت انگیز بات ہے کہ آج بھی ہمارے درمیان بے شمار لوگ ہیں جو اس قسم کی وقتی اور ظاہری کامیابیوں کو اپنی صداقت کا لازمی ثبوت سمجھتے ہیں ——— خارجی فرقہ دنیا سے ختم ہو گیا، مگر خارجیت آج بھی دنیا میں زندہ ہے۔

وضعی قانون اور الٰہی قانون

راسکو پاونڈ (۱۸۷۰ - ۱۹۶۴) نے قانون کا مقصد سماجی انجینیرنگ (SOCIAL ENGINEERING) بتایا ہے۔ یہ بیان یقیناً صحیح ہوتا بشرطیکہ پاونڈ (ROSCOE POUND) یہ بھی ثابت کرسکتا کہ انسانی سماج کمپیوٹر رول کا ایک مجموعہ ہے۔ مگر بدقسمتی سے امریکی پروفیسر کے لئے یہ ثابت کرنا ممکن نہیں۔ اور یہی وہ مقام ہے جہاں وضعی قانون کی اس کمزوری کا راز چھپا ہوا ہے جس کی بنا پر وہ ڈھائی ہزار سالہ کوششوں کی تاریخ رکھنے کے باوجود اب تک اپنا کوئی قابل قبول اصول قانون دریافت نہ کرسکا۔

ایک شخص جب اصول قانون کا مطالعہ کرتا ہے تو اس کے سامنے تقریباً ایک درجن بڑے بڑے اسکولوں کے نام آتے ہیں۔ مگر فنی تفصیلات سے قطع نظر کرکے دیکھا جائے تو ان مدارس فکر کو اصولی طور پر دو قسموں میں بانٹا جاسکتا ہے۔ ایک، نظریاتی اصول قانون (IDEOLOGICAL JURISPRUDENCE) جو اس تلاش میں مصروف ہے کہ "قانون کو کیسا ہونا چاہئے" (LAW AS IT OUGHT TO BE)۔ دوسرے، تحلیلی اصول قانون (ANALYTICAL JURISPRUDENCE) جو قانون کی تعبیر ویسی ہی کرنا چاہتا ہے "جیسا کہ وہ ہے" (LAW AS IT IS)۔ اصول قانون کی تاریخ بتاتی ہے کہ یہ دونوں قسم کے اسکول کسی قابل قبول نتیجہ تک پہنچنے میں مکمل طور پر ناکام رہے ہیں۔ علمائے قانون جب قانون کی تشریح ثانی الذکر اصول کی روشنی میں کرتے ہیں تو انھیں اس تنقید کا سامنا کرنا پڑتا ہے کہ قانون کا منطقی جواز ان کے ہاتھ سے نکل گیا اور جب اول الذکر اصول کی روشنی میں قانون کو سمجھنا چاہتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ایسی کسی چیز کی دریافت ممکن ہی نہیں۔

ایک طرف وہ علمائے قانون ہیں جو قانون کو محض اس نظر سے دیکھتے ہیں کہ وہ انسانی سماج کا ایک خارجی ڈھانچہ ہے، اس لئے اس کو معلوم قواعد وضوابط کی روشنی میں ٹھیک اسی طرح بنایا جاسکتا ہے جیسے عجائب خانہ میں جانوروں کے لئے کٹہرا بنایا جاتا ہے۔ اسی نقطۂ نظر کی ایک وکالت جان آسٹن (۱۷۹۰ - ۱۸۵۹) کا مشہور نظریہ تھا جس میں اس نے کہا:

LAW IS WHAT IS IMPOSED BY A SUPERIOR ON AN INFERIOR,
BE THAT SUPERIOR THE KING OR THE LEGISLATURE.

یعنی قانون ان احکام کا نام ہے جو سیاسی طور پر اعلیٰ ہستی کی طرف سے سیاسی طور پر ادنیٰ ہستی کے اوپر نافذ کیا گیا ہو۔ یہ اعلیٰ ہستی خواہ بادشاہ ہو یا مقننہ۔

جان آسٹن (JOHN AUSTIN) کا یہ نظریہ بظاہر ایک قابلِ عمل نظریہ ہونے کے باوجود منطقی صحت سے مکمل

طور پر محروم ہے۔ کیونکہ یہ قانون ساز کو یہ مقام دے دیتا ہے کہ اس کا عمل انصاف کے میاروں سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ حالاں کہ انسانی عقل کبھی اس کو قبول نہیں کر سکتی کہ انصاف (JUSTICE) کے تصور کو قانون سے الگ کر دیا جائے۔ قانون جب کسی کے اوپر ایک فیصلہ کا نفاذ کرتا ہے تو اس کا یہ فیصلہ اسی وقت جائز فیصلہ ہے جب کہ وہ انصاف پر مبنی ہو۔

تاہم آج تمام دنیا میں، عملی طور پر، جان آسٹن ہی کے نظریہ کی حکمرانی ہے۔ نام نہاد آزاد دنیا میں یہ کام بغیر کسی اصولِ قانون کے ہو رہا ہے۔ ایک فرانسیسی قانون داں نے جو بات اپنی حکومت کے بارے میں کہی ہے، وہی دوسری تمام حکومتوں پر بھی صادق آتی ہے:

OUR GOVERNMENT HAS THE POWER BUT NOT THE RIGHT.

ہماری حکومت کے پاس قانون کے نفاذ کے لئے طاقت ہے مگر اس کا اسے کوئی حق نہیں۔

اشتراکی دنیا میں یہ جبری منطق اس سوویت اصول قانون کے تحت نافذ ہے کہ اشتراکی یا سماجی تعلقات (SOCIAL RELATIONSHIPS) ہی کا دوسرا نام قانون ہے۔ اشتراکی دنیا میں چونکہ علمی تحقیق بھی سیاست ہی کا ایک حصہ ہے، اس لئے باہر کی دنیا کے مفکرین کی اِس تنقید کا اُس پر کوئی اثر نہیں پڑتا کہ قانون کی یہ سوشلسٹ تفسیر قانون کے معیاری کردار (NORMATIVE CHARACTER) کا انکار کر رہی ہے اور قانون کو گھٹا کر صرف اقتصادی قانون بنا دیتی ہے (IT REDUCES LAW TO ECONOMIC LAW)

اگرچہ عملی طور پر ساری دنیا میں یہی صورت حال ہے کہ سیاسی طاقت کے زور پر قوانین بنتے ہیں اور رائج کئے جاتے ہیں۔ مگر علمائے قانون کا ایک طبقہ اس سے بے نیاز ہو کر اصول قانون کی علمی تلاش میں مصروف ہے۔ تاہم اس کی اب تک کی تلاش نے اُس کو صرف اس نتیجہ تک پہنچایا ہے کہ اصول قانون کے معاملہ میں کسی متفقہ معیار تک پہنچنا ممکن نہیں۔ کیونکہ اس تلاش کا مقصد قانونی معیارات (LEGAL NORMS) کا تعین ہے، اور قانونی معیارات کا تعین اسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ بنیادی انسانی اقدار کا تعین ہو جائے۔ اور تمام علمار کا فیصلہ ہے کہ اقدار (VALUES) کی دریافت خالص عقلی طریقوں سے ممکن نہیں۔

اصول قانون کا مقصد قانون کی فلسفیانہ بنیاد (فلاسیفیکل فاؤنڈیشن) یا اس کی قانونی قدر (لیگل ویلو) تلاش کرنا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اصول قانون کا کام یہ ہے کہ وہ قانون کے لئے 'وجہ جواز' (JUSTIFICATION) فراہم کرے۔ جب تک کوئی قانون اپنی پشت پر قابلِ قبول اصولِ قانون نہ رکھتا ہو، عقلاً جائز نہیں کہ وہ ان انسانوں کے اوپر نافذ کیا جائے جن کے لئے کسی چیز کی قدر و قیمت جاننے کا واحد معیار عقل ہے۔ چنانچہ معلوم تاریخ کے مطابق انسان ڈھائی ہزار سال سے اس تلاش و جستجو میں مصروف ہے، مگر بے شمار دماغوں کی جدوجہد کے باوجود اب تک وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکا۔

قانون کی تاریخ بتاتی ہے کہ جب انسان لکھنا نہیں جانتا تھا، اس وقت بھی قانون کسی نہ کسی شکل میں

موجود تھا۔ تحریر کی دریافت کے بعد اس کو لکھا بھی جانے لگا۔ سب سے قدیم تحریری قانون جو مل سکا ہے، وہ سمیری بادشاہ حمورابی کا قانون ہے جو ۱۹۰۰ ق م میں وضع ہوا تھا۔ سمیری قوم دجلہ و فرات کی وادی میں رہتی تھی۔

اصولِ قانون پر غور و فکر کا کام، تاریخی ریکارڈ کے مطابق، یونانی فلاسفہ سے شروع ہوا۔ سولن جو قدیم یونان کا مشہور قانون داں تھا، اس کا زمانہ مسیح سے چھ سو سال قبل کا ہے۔ افلاطون (۳۴۷ - ۴۲۷ ق م) کی کتاب قانون پر قدیم زمانہ کی مشہور ترین کتاب ہے۔ قانونی پیشہ بھی سب سے پہلے روم میں مسیح سے تقریباً پانچ سو سال قبل شروع ہوا۔ پندرھویں صدی تک قانون علم الٰہیات ہی کا ایک جز سمجھا جاتا تھا۔ سولھویں صدی میں وہ نیا ذہن پیدا ہوا جس نے بالآخر قانون کو مذہب سے الگ کر دیا۔ تاہم اب بھی وہ علم سیاست کا ایک جزو بنا رہا۔ انیسویں صدی کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس نے فلسفۂ قانون کو فلسفہ سیاست سے الگ کیا اور اصول قانون کو ایک مستقل علم کی حیثیت سے ترقی دے کر اس کو اختصاصی مطالعہ کا موضوع بنا دیا۔

قدیم زمانہ کے فلاسفہ کچھ مسلمات سے اپنا اصول قانون اخذ کرتے تھے جن کو وہ فطری حقوق کہتے تھے۔ سولھویں صدی کے بعد یورپ میں جو ذہنی انقلاب آیا، اس نے ثابت کیا کہ یہ مسلّمات حقیقۃً مفروضات ہیں جن کے لئے کوئی عقلی دلیل موجود نہیں۔ اس کے بعد فرد کی آزادی سب سے بڑا مسلّمہ قرار پائی جس کو اصول قانون کی بنیاد بنایا جا سکتا تھا۔ مگر صنعتی انقلاب کے نتائج نے بتایا کہ فرد کی آزادی کو اگر خیر اعلیٰ (SUMMUM BONUM) مان لیا جائے تو وہ انسانیت کو استحصال اور انارکی کے سوا اور کہیں نہیں پہنچاتی۔ اب اجتماعی بھلائی (SOCIAL GOOD) کو سب سے بڑا خیر قرار دیا گیا جو قانون سازی کے لئے رہنما اصول کی حیثیت رکھتی تھی۔ مگر جب اس نظریہ کے پیچھے ہی استعمال سے ایک ہولناک سیاسی جبر وجود میں آیا تو معلوم ہوا کہ فرد کی آزادی اگر سماج کے لئے نقصان دہ تھی تو سماجی بھلائی کا یہ نظریہ فرد کو مجبور و مقہور بنا کر رکھ دیتا ہے۔ بیسویں صدی فرد اور سماج کے درمیان مطابقت تلاش کرنے کی صدی ہے۔ موجودہ صدی کے نصف ثانی میں جن مدارسِ فکر کو قبولیت حاصل ہوئی، ان کا خلاصہ یہ تھا کہ وہ کسی نہ کسی طور پر قانون کی ایسی بنیاد ڈھونڈ رہے تھے جہاں فرد اور سماج کے مختلف تقاضوں کو ہم آہنگ کیا جا سکے۔ مگر یہ تجربہ بھی ناکامی کے سوا کہیں اور پہنچتا ہوا نظر نہیں آتا۔ آج بھی ایسی کتابیں شائع ہو رہی ہیں جن کا ٹائٹل اس قسم کا ہوتا ہے:

LAW IN QUEST OF ITSELF

(قانون خود اپنی تلاش میں) حتیٰ کہ علمائے قانون کے ایک طبقہ نے اپنا یہ آخری فیصلہ دے دیا ہے کہ ایسی کسی کوشش کی کامیابی کا کوئی امکان نہیں:

A PURELY LOGICAL INTERPRETATION OF LEGAL RULES IS IMPOSSIBLE

قانونی احکام کی خالص منطقی تعبیر ناممکن ہے۔ گستاو ریڈبرش (۱۹۴۹ - ۱۸۷۸) کا کہنا ہے کہ مطلوبہ قانون

Scientifically known

صرف بذریعہ اقرار (CONFESSION) اپنایا جا سکتا ہے نہ اس لئے کہ وہ علمی طور پر معلوم ہے۔ ریڈبرش (GUSTAV_RADBRUCH) کی مثال کوئی انفرادی مثال نہیں، بلکہ اسی بنیاد پر ایک مستقل مدرسۂ فکر وجود میں آیا ہے جس کو اضافی مدرسۂ فکر کہتے ہیں۔ اس فکر کے حاملین (RELATIVISTS) کا کہنا ہے:

ABSOLUTE JUDGMENTS ABOUT LAW ARE NOT DISCOVERABLE

مطلق قانون قابل دریافت نہیں۔

جیسا کہ عرض کیا گیا، اصول قانون کی اصل مشکل یہ ہے کہ وہ جس چیز کی تلاش میں ہے، اس کا براہ راست تعلق مسئلہ اقدار سے ہے اور یہ مسئلہ وہ ہے جہاں انسانی عقل اپنی ساری کوشش کے باوجود کسی متفقہ جواب تک پہنچنے میں قطعاً ناکام رہی ہے۔ ایک طرف یہ صورت ہے کہ انسان، وجدانی طور پر، خیر و شر کا اتنا شدید احساس رکھتا ہے کہ اس کو نہ تو اٹھارویں صدی کے میکانکی فلسفے ختم کر سکے اور نہ سوویت روس کا کلیت پسندانہ نظام، جس کو نصف صدی سے بھی زیادہ طویل عرصہ تک یہ موقع ملا کہ وہ نسل انسانی کو اپنے نظریاتی کارخانہ میں ڈھال سکے۔ دوسری طرف یہ مشکل کہ بہترین دماغوں کی ساری کوشش بھی اقدار کا کوئی متفقہ معیار تلاش کرنے میں مکمل طور پر ناکام رہی ہے۔ سائنس کی ترقی اس کو زیادہ سے زیادہ واضح کرتی جا رہی ہے کہ ہم ایک ایسی دنیا میں ہیں جہاں اقدار اپنا کوئی معروضی مقام (OBJECTIVE STATUS) نہیں رکھتیں۔

جوزف وڈکرچ (۱۸۹۳ — ۱۹۷۰) نے اپنی کثیر الاشاعت کتاب (THE MODERN TEMPER) میں اس کا مطالعہ کیا ہے۔ "خواہ انسان کتنی ہی کوشش کرے"، پروفیسر کرچ (JOSEPH WOODKRUTCH) لکھتے ہیں "اس کی روح کے دو نصف مشکل ہی سے باہم متحد ہو سکتے ہیں۔ اور وہ نہیں جانتا کہ وہ اس طرح خیال کرے جیسے کہ اس کی عقل بتاتی ہے کہ اسے خیال کرنا چاہئے، یا وہ اس طرح محسوس کرے جیسے اس کے جذبات اس کو محسوس کراتے ہیں۔ اور اس طرح وہ اپنی برباد اور تقسیم شدہ روح کے اندر ایک مضحکہ بن کر رہ گیا ہے"۔

کرچ کا یہ جملہ اکثر نقل کیا گیا ہے:

MAN IS AN ETHICAL ANIMAL IN AN UNIVERSE
WHICH CONTAINS NO ETHICAL ELEMENT. (16)

انسان ایک اخلاقی جانور ہے ایک ایسی کائنات میں جو اپنے اندر کوئی اخلاقی عنصر نہیں رکھتی۔

کرچ کی غلطی یہ ہے کہ اس نے اپنے دائرہ سے باہر قدم رکھ دیا ہے۔ میں جس بنیادی نکتہ پر زور دینا چاہتا ہوں، وہ یہ کہ جو چیز ثابت ہوئی ہے، وہ یہ نہیں کہ اقدار کا کوئی وجود نہیں ہے۔ بلکہ یہ کہ انسان ان کو دریافت نہیں کر سکتا۔ یہاں میں ڈاکٹر الکسس کیرل (۱۸۷۳ — ۱۹۴۴) کا حوالہ دوں گا۔ ڈاکٹر کیرل (ALEXIS CARREL) نے اپنی کتاب انسان نامعلوم (MAN THE UNKNOWN) میں دکھایا ہے کہ اقدار کا مسئلہ اتنے مختلف النوع علوم کی کامل واقفیت سے تعلق رکھتا ہے جن کو انسان اپنی محدود عمر میں کسی طرح حاصل

نہیں کرسکتا۔ ان کو حاصل کرکے ان کا تجزیہ کرنا اور نتیجہ نکالنا تو درکنار۔ انھوں نے مزید اس بات کو رد کردیا ہے کہ ماہرین کی ایک کمیٹی اس مسئلہ کی تحقیق کرکے کسی آخری نتیجہ پر پہنچنے کی کوشش کرے، کیونکہ "ایک اعلیٰ آرٹ کی تخلیق ایک ذہن کرتا ہے، اعلیٰ آرٹ کسی اکیڈمی کے ذریعہ کبھی وجود میں نہیں آتا۔"

سگمنڈ فرائڈ (۱۹۳۹-۱۸۵۶) کے وقت سے اب تک نفسیات کے جو مختلف اسکول وجود میں آئے ہیں، وہ باہمی اختلافات کے باوجود اس مشترکہ کوشش میں مصروف رہے ہیں کہ نفسیات کا کوئی اقدار سے آزاد علم (VALUE FREE SCIENCE) وجود میں لائیں۔ مگر یہ ایک واقعہ ہے کہ ایک صدی کی مسلسل کوششوں کے باوجود وہ اس منزل تک پہنچنے میں بالکل ناکام رہے ہیں۔ حتیٰ کہ اب ان کے درمیان اس کے خلاف رد عمل شروع ہوگیا ہے۔ مثال کے طور پر امریکہ کا ممتاز ماہر نفسیات ابرہام میسلو (۱۹۷۰-۱۹۰۸) جو خود ثبوتی کرداریت (POSITIVISTIC-BEHAVIOURISTIC TRADITION) کے زیر سایہ تیار ہوا تھا، اپنی عمر کے آخری حصہ میں وہ انسانی فطرت کے دور تر گوشے (FARTHER REACHES OF HUMAN NATURE) کی تلاش میں مصروف ہوگیا۔ میسلو (ABRAHAM MASLOW) کا کہنا ہے:

PSYCHOLOGY HAD VOLUNTARILY RESTRICTED ITSELF
TO ONLY HALF OF ITS RIGHTFUL JURISDICTION.

نفسیات نے اپنے جائز حدود کار کے نصف حصہ سے بطور خود اپنے آپ کو روک لیا۔

الٰہی قانون

وضعی قانون کی ناکامی کے بارے میں اوپر میں نے جو اشارات کیے، وہ ہر وہ شخص جانتا ہے جس نے اصول قانون کا مطالعہ کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قانون دانوں کا یہ مفروضہ قطعی طور پر بے بنیاد ثابت ہو چکا ہے کہ انسان خود اپنے لئے قانونی معیار دریافت کرسکتا ہے۔

اس کے بعد ہمارے سامنے دوسرا مفروضہ آتا ہے اور وہ الٰہی قانون کا مفروضہ ہے۔ الٰہی قانون، جس کا محفوظ اور مستند متن قرآن کی شکل میں ہمارے پاس موجود ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ قانون کا ماخذ خدا کا الہام ہے یعنی یہ کہ اس کائنات کا ایک خدا ہے۔ خدا نے الہام کے ذریعہ اپنا قانون اپنے رسول پر اتارا ہے یہی قانون انسان کے لئے صحیح ترین دستور العمل ہے۔ اس قانون کی بنیاد پر قیاس اور اجتہاد کرکے مزید قانون سازی ہوسکتی ہے۔ مگر اصولی طور پر اس سے انحراف جائز نہیں۔

میں پیشگی طور پر اعتراف کرتا ہوں کہ خالص علمی اعتبار سے یہ ایک پیچیدہ دعویٰ ہے۔ مگر جو نکتہ خصوصی طور پر قابل لحاظ ہے، وہ یہ کہ اس کی پیچیدگی کے اسباب خود قانون میں ہونا ضروری نہیں۔ وہ اس واقعہ میں بھی ہوسکتے ہیں کہ ہماری عقل کچھ محدودیتوں (LIMITATIONS) کا شکار ہے اور اس بنا پر وہ سارے حقائق کا براہ راست

احاطہ نہیں کرسکتی۔ خوش قسمتی سے جدید سائنس کا موقف اس معاملہ میں ہماری تائید کرتا ہے۔ جدید سائنس نے یہ اعتراف کیا ہے کہ حقائق کی مقدار صرف اتنی ہی نہیں جو براہ راست ہمارے حسیاتی تجربہ میں آتی ہیں۔ بلکہ اس سے آگے اور بھی حقائق ہیں۔ مزید یہ کہ نامعلوم حقائق نہ صرف معلوم حقائق سے مقدار میں زیادہ ہیں بلکہ وہ معلوم حقائق کے مقابلہ میں زیادہ اہم اور معنی خیز ہیں۔ امریکی پروفیسر فرڈ برتھولڈ (FRED BERTHOLD) نے منطقی ثبوتیت (LOGICAL POSITIVISM) کے فلسفہ کو چند لفظوں میں اس طرح سمیٹا ہے:

THE IMPORTANT IS UNKNOWABLE, AND THE KNOWABLE IS UNIMPORTANT

جو چیز اہم ہے وہ ناقابل دریافت ہے اور جو چیز قابل دریافت ہے، وہ اہم نہیں۔

۱۹ ویں صدی میں یہ فرض کرلیا گیا تھا کہ انسان کلی حقیقت کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اگرچہ اس وقت بھی کلی حقیقت عملاً انسان کی دسترس سے اتنی ہی دور تھی جتنی اس سے پہلے یا اس کے بعد رہی ہے۔ تاہم یہ یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن انسان ضرور اسے دریافت کرلے گا۔ مگر بیسویں صدی کے سائنسداں خود ثبوتیت (POSITIVISM) یا فعلیت (OPERATIONALISM) کے جھنڈے کے نیچے ہم کو بتا رہے ہیں کہ یہ فرض کرلینا بالکل غلط تھا کہ سائنس ہم کو آخری حقیقت (ULTIMATE REALITY) یا خیر (GOOD) کے بارے میں کوئی بات بتا سکتی ہے۔ وقت کا دوسرا فلسفہ جس کو وجودیت (EXISTENTIALISM) کہا جاتا ہے، وہ بھی ہم کو یقین دلا رہا ہے کہ اس کی کوئی صورت نہیں کہ محدود انسان خیر کا ایسا معیار (NORM) دریافت کرسکے جو اس سے ماورا ہو۔

ان دریافتوں کے بعد انسانی علم اب جس مسئلہ پر پہنچا ہے، وہ یہ کہ قطعی دلائل صرف اس میدان تحقیق میں قائم کئے جاسکتے ہیں جن کو برٹرینڈ رسل (۱۸۷۲–۱۹۷۰) نے چیزوں کا علم (KNOWLEDGE OF THINGS) کہا ہے۔ دوسرا میدان تحقیق جو اس کے الفاظ میں صداقتوں کا علم (KNOWLEDGE OF TRUTHS) سے تعلق رکھتا ہے، ان میں براہ راست دلیل قائم کرنا ممکن نہیں۔ چنانچہ مان لیا گیا ہے کہ ہم کسی معاملہ میں قطعیت (CERTAINTY) تک نہیں پہنچ سکتے۔ ہم صرف یہ کرسکتے ہیں کہ اغلب رائے (PROBABLE JUDGMENT) تک پہنچنے کی کوشش کریں۔ یہ بات صرف غیر مادی حقائق تک محدود نہیں ہے بلکہ بہت سی وہ چیزیں جن کو مادی حقائق میں شمار کیا جاتا ہے، ان کا معاملہ بھی تقریباً ایسا ہی ہے، جیسے روشنی، یا مقناطیسی قوت کی تشریح۔

میں یہ کہنے کی جرأت کروں گا کہ فیصلہ کی یہ بنیاد جو جدید علم نے فراہم کی ہے، وہ عین الٰہی قانون کے حق میں ہے۔

الٰہی قانون کا یہ مفروضہ کہ اس کائنات کا ایک خدا ہے، غالباً جدید انسان کے لئے اتنا زیادہ ناقابل فہم نہیں جتنا اس کا یہ جزو کہ خدا بذریعہ الہام اپنی مرضی انسان کے پاس بھیجتا ہے۔ اکثر بڑے بڑے سائنس داں کسی نہ کسی شکل میں خدا کو مانتے تھے۔ نیوٹن (۱۶۴۲–۱۷۲۷) کے نزدیک نظام شمسی کو متحرک کرنے کے لئے ایک خدائی ہاتھ (DIVINE ARM) کی ضرورت تھی۔ ڈارون (۱۸۰۹–۱۸۸۲) آغاز حیات کے لئے ایک خالق (CREATOR)

کو ضروری سمجھتا تھا۔ آئن سٹائن (۱۹۵۵ - ۱۸۷۹) کو ایک برتر ذہن (SUPERIOR MIND) کی جھلک دکھائی دی جو کائنات کے مظاہر میں اپنے کو ظاہر کر رہا تھا۔ سر جیمس جینس (۱۹۴۶ - ۱۸۷۷) کے مطالعہ نے اسے اس نتیجہ تک پہنچایا ہے کہ کائنات "گریٹ مشین" سے زیادہ "گریٹ تھاٹ" معلوم ہوتی ہے۔ سر آرتھر ایڈنگٹن (۱۹۴۴ - ۱۸۸۲) کے نزدیک جدید سائنس ہمیں اس حقیقت تک پہنچا رہی ہے کہ:

THE STUFF OF THE WORLD IS MIND-STUFF

(کائنات کا مادہ ایک شے ذہنی ہے)۔ ایلفرڈ نارتھ وائٹ ہڈ (۱۹۴۷ - ۱۸۶۱) کے نزدیک جدید سائنسی معلومات یہ ثابت کر رہی ہیں کہ فطرت ایک زندہ حقیقت ہے نہ کہ بے روح مادہ (NATURE IS ALIVE)

تاہم جہاں تک الہام کا تعلق ہے، مجھے اعتراف ہے کہ خالص علمی اعتبار سے یہ ایک نہایت پیچیدہ عقیدہ ہے۔ یہ ان چیزوں میں سے نہیں جس کا عمومی مشاہدہ کرایا جا سکتا ہو۔ مگر یہ کہنا مبالغہ آمیز نہیں کہ ہمارے تجربہ میں ایسے بہت سے حقائق آئے ہیں جن سے استنباط کیا جا سکتا ہے کہ یہاں ایسی کوئی حقیقت پائی جاتی ہے جس کو الہام سے تعبیر کیا جا سکے۔ جدید میتھڈالوجی اس کو تسلیم کرتی ہے کہ مستنبط حقائق (INFERED FACTS) بھی اتنے ہی یقینی ہو سکتے ہیں جتنے کہ مشہود حقائق (OBSERVED FACTS)۔ اس لئے ہمارے استدلال کی اہمیت اس سے کم نہیں ہوتی کہ وہ مشاہداتی نہیں ہیں بلکہ استنباطی نوعیت کے ہیں۔

۱۹ ویں صدی میں قانون تعلیل (PRINCIPLE OF CAUATION) کو خالق کا بدل سمجھ لیا گیا تھا۔ مگر موجودہ صدی میں ایسے بہت سے واقعات سائنس کے علم میں آئے ہیں جن کی توجیہہ اسباب مادی کے عام اصول کے تحت نہیں ہوتی۔ مثال کے طور پر ریڈیم کے الکٹران کا ٹوٹنا، جن کو معلوم قوانین کے تحت بیان کرنے کی ساری کوشش ناکام ہو چکی ہے۔ حتیٰ کہ ایک سائنس داں کو کہنا پڑا کہ ریڈیم کے کسی ٹکڑے میں کون سا الکٹران کس وقت ٹوٹے گا، اس کا فیصلہ کرنا خداؤں کے اختیار میں ہے، خواہ وہ جو بھی ہوں:

IT MAY REST ON THE KNEES OF WHATEVER GOODS THERE BE

حیوانات کا مطالعہ بھی یہی بتاتا ہے۔ حیوانات کے بارے میں ثابت ہو چکا ہے کہ ان کے اندر جو جبلت (INSTINCT) ہوتی ہے، وہ اکتسابی نہیں۔ مثلاً شہد کی مکھی اپنے چھتہ کو ہشت پہل بناتی ہے۔ کسی تربیت نے اس کو نہیں بتایا کہ ہشت پہل خانہ کے مقصد کے لئے سب سے زیادہ موزوں ہے، حتیٰ کہ وہ اس کی معنویت کا کبھی کوئی ذاتی شعور نہیں رکھتی۔ اس کے باوجود وہ اس ریاضیاتی طریق تعمیر میں اس طرح مصروف رہتی ہے جیسے اس سے کسی نے کہہ دیا ہو کہ تم ایسا ہی کرو۔ (وَاَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ، نحل - ۶۸)

اس قسم کے بے شمار واقعات ہیں جو ہمیں اس اغلبیت کی طرف لے جاتے ہیں کہ اشیاء سے باہر کوئی شعور ہے جو اشیاء کو ان کے وظیفۂ حیات کے بارے میں ہدایات دے رہا ہے۔ حتیٰ کہ سر آرتھر اڈنگٹن نے جدید کوانٹم نظریہ کو الہام کی سائنسی تصدیق قرار دیا ہے۔ قرآن کا یہ بیان بیسویں صدی کے انسان کے لئے شاید اس سے زیادہ

قابلِ فہم ہے جتنا وہ ساتویں صدی کے انسان کے لئے ہوسکتا تھا:

وَاَوْحٰی فِی کُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَھَا (حٰمٓ سجدہ ۔ ۱۲) اور خدا نے ہر آسمان میں اس کا حکم اتارا

اس کے بعد جب ہم انسان کے مسئلہ پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی زندگی کے دو حصے ہیں۔ ایک وہ جس کو حیاتیاتی حصہ کہہ سکتے ہیں۔ دوسرا وہ جس کو نفسیاتی حصہ کہا جاتا ہے۔ انسانی زندگی کا حیاتیاتی حصہ ٹھیک اسی طرح مکمل طور پر خارجی قوانین کا پابند ہے جس طرح کائنات کی دوسری چیزیں اس کی پیروی کر رہی ہیں۔ وہ چیز جس کو میڈیکل سائنس کہا جاتا ہے، اس کا کام صرف یہ ہے کہ وہ ان مخفی قوانین فطرت کا پتہ لگائے جس کے تحت انسانی زندگی کا حیاتیاتی حصہ کام کرتا ہے اور اس کو اس حصہ انسانی پر استعمال کرے۔ اب اگر یہ مان لیا جائے کہ وہ قانون فطرت جو ستاروں اور سیاروں سے لے کر انسان کے حیاتیاتی حصہ تک کارفرما ہے، اس کا ماخذ وہ الہام ہے جو کائناتی شعور کی طرف سے ہر ایک کو پہنچ رہا ہے تو اس کے بعد، اسی پر قیاس کرتے ہوئے، یہ ماننا خود بخود آسان ہو جاتا ہے کہ انسان کے نفسیاتی حصہ کے لئے قانون کا تعین بھی اسی شعور کی طرف سے ہوسکتا ہے اور اسی کی طرف سے ہونا چاہئے۔

خالص عقلی نقطۂ نظر سے کہا جاسکتا ہے کہ اس استدلال کی بنیاد ایک "قیاس" پر قائم ہے۔ مگر یہ یہ ثابت ہو چکا ہے کہ انسان کی ساخت کچھ اس ڈھنگ پر ہوئی ہے کہ قیاسی استدلال سے مفر اس کے لئے ممکن نہیں۔ اگر وہ قیاسی استدلال کو تسلیم کرنے سے انکار کرے تو لازماً اس کو تشکیک کی پناہ گاہ میں جانا پڑیگا۔ جو عملی طور پر ناممکن ہے۔

قرآن نے بھی اس معاملہ میں جواب کا یہی انداز اختیار کیا ہے:

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ، قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا

تم سے وحی کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ کہہ دو کہ وحی خدا کے حکم سے ہے اور تم کو صرف تھوڑا علم دیا گیا ہے

یہاں وحی سے متعلق سوال کے جواب میں دو باتیں کہی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ یہ امرِ رب ہے۔ دوسرے یہ کہ تم کو علم قلیل دیا گیا ہے۔ پہلے جزو کا مطلب یہ ہے کہ وحی اسی طرح انسان کے لئے امرِ رب ہے جس طرح سارا نظامِ عالم امرِ رب (قانون فطرت) کے ماتحت ہے۔ یہ کوئی منفرد چیز نہیں بلکہ انسانی دائرہ میں وہی چیز ہے جس کا مشاہدہ تم کائنات کے دائرہ میں کر رہے ہو۔ دوسرے جزو کا مطلب یہ ہے کہ وحی کو عقلی طور پر سمجھنے کی پہلی شرط یہ ہے کہ تم اس حقیقتِ واقعہ کو تسلیم کرو کہ انسان کو علم قلیل دیا گیا ہے۔ اس کو علم کثیر نہیں دیا گیا۔ اس واقعہ کو مان کر چلو گے تو وحی کی حقیقت سمجھ جاؤ گے اور اگر اس واقعہ کا انکار کر کے سمجھنا چاہو تو تم اس کو نہیں سمجھ سکتے۔

حیرت انگیز بات ہے کہ تیرہ سو برس پہلے کا اعلان آج سائنس کے جدید ترین مرحلہ میں اپنی صداقت کو مزید شدت کے ساتھ ثابت کر رہا ہے۔ پہلی جنگ عظیم (۱۸ ۔ ۱۹۱۴) کے ساتھ جس نئے دور سائنس کا آغاز ہوا ہے،

اس نے قطعیت کے ساتھ تسلیم کر لیا ہے کہ انسان بعض حیاتیاتی اور نفسیاتی محدودیتوں کا شکار ہے۔ اس لئے وہ سارے حقائق کو اپنے محسوسات کی گرفت میں نہیں لا سکتا۔ ضروری ہے کہ اپنے قلت علم کی اس کمی کو پورا کرنے کے لئے وہ مروجہ سائنسی طریقوں پر بعض ایسے طریقوں کا اضافہ کرے جو انیسویں صدی تک غیر سائنسی سمجھے جاتے تھے۔

آئن سٹائن نے کائنات کے بارے میں جو انقلاب انگیز سائنسی نظریات وضع کئے، اس کے سلسلے میں اس نے اعتراف کیا کہ یہ کام اس طریقہ کی پابندی کر کے نہیں ہو سکتا۔ مثال کے طور پر، حرکیات گیس کا نظریہ (KINETIC THEORY OF GASES) میں کارآمد ہے۔ یہاں اس نے ترکیبی طریقہ (SYNTHETIC METHOD) کے بجائے تحلیلی طریقہ (ANALYTICAL METHOD) سے کام لیا۔ اس نے سائنسی نظریات کی دو تقسیمیں کیں۔ ایک عمارتی نظریات (CONSTRUCTIVE THEORIES) دوسرے اصولی نظریات (PRINCIPLE-THEORIES) اس نے کہا کہ نظریہ اضافیت (RELATIVITY) کو سمجھنے کے لئے صرف دوسرے قسم کا نظریہ ہی کام دے سکتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس نے کائنات کے گہرے حقائق کو سمجھنے کے لئے سائنسی مشاہدہ کے بجائے ایک قسم کے سائنسی تصور (SCIENTIFIC CONTEMPLATION) کی وکالت کی۔ چنانچہ ایک پروفیسر نے آئن سٹائن کے نظریہ کا خلاصہ ان لفظوں میں بیان کیا ہے:

IN DEALING WITH THE ETERNAL VERITIES, THE AREA OF EXPERIMENT IS REDUCED AND THAT OF CONTEMPLATION ENHANCED.

ابدی حقیقتوں کی بحث میں تجربہ کا دائرہ گھٹ جاتا ہے اور تصور کا دائرہ بڑھ جاتا ہے۔

قرآن کا دعویٰ ہے کہ وہ ایک الہامی قانون ہے جو انسان کی رہنمائی کے لئے اتارا گیا ہے۔ یہ بات کہ وہ فی الواقع ایک الہامی قانون ہے، اس کے لئے خود قرآن نے بڑی عجیب دلیل دی ہے۔ اس نے اعلان کیا ہے کہ انسان کبھی بھی اس کے جیسی کتاب نہ بنا سکے گا، خواہ وہ اس کے لئے کتنی ہی کوشش کر ڈالے:

وَاِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ بقرہ ۔ ۲۳	اور اگر تم اس کتاب کے بارے میں شک میں ہو جو ہم نے اپنے بندہ پر اتاری ہے تو اس جیسی ایک سورت بنا کر لے آؤ
قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰۤی اَنْ یَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا یَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِیْرًا بنی اسرائیل ۔ ۸۸	کہہ دو اگر آدمی اور جن اس لئے جمع ہوں کہ ایسا قرآن بنا لائیں تو وہ ہرگز نہ لا سکیں گے خواہ وہ سب ایک دوسرے کے مددگار ہوں

انسائیکلوپیڈیا آف فلاسفی کے مقالہ نگار کے الفاظ میں، فلسفیانہ اعتبار سے جو بنیادی سوال پیدا ہوتا ہے وہ یہ کہ وہ کیا معیار ہے جس پر الہام کے دعوے کو جانچا جا سکے:

THE MAIN PHILOSOPHICAL QUESTION THAT ARISES CONCERNS THE CRITERIA BY WHICH REVELATION CLAIMS MAY BE JUDGED.

چند نئی کتابیں

تجدید دین

تجدید کا مطلب ہے خدا کے دین کو انسانی گرد وغبار سے پاک کرنا۔ آج اسلام پر وہ سارے "گرد وغبار" پڑ چکے ہیں جو پچھلی امتوں کے دین پر پڑے تھے۔ یہ گرد وغبار کیا ہے اور خدا کے دین کو کس طرح اس سے پاک صاف کیا جا سکتا ہے، "تجدید دین" میں اس کا مطالعہ کیجئے۔ صفحات ۴۸

مذہب اور جدید چیلنج

"علم جدید کا چیلنج" مولانا وحید الدین خاں کی مشہور کتاب ہے۔ "مذہب اور جدید چیلنج" اسی کا نظر ثانی کیا ہوا ایڈیشن ہے۔ یہ کتاب پہلی بار ۱۹۶۷ میں اردو میں شائع ہوئی تھی۔ اس کے بعد عربی اور ترکی زبانوں میں اس کے درجن سے اوپر ایڈیشن شائع ہوئے۔ تمام عالم اسلام میں اس کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ ۱۹ فروری ۱۹۷۶ کو مولانا وحید الدین خاں طرابلس میں صدر قذافی سے ملے تو لیبی لیڈر نے فوراً کہا: لقد قرأت کتابك الاسلام یتحدیٰ (میں نے آپ کی کتاب الاسلام یتحدیٰ پڑھ لی ہے)۔
الامام الاکبر ڈاکٹر عبدالحلیم محمود (جامعہ ازہر قاہرہ) نومبر ۱۹۷۵ میں ہندستان آئے انھوں نے جامعہ ڈابھیل سورت میں تقریر کرتے ہوئے علماء سے کہا کہ آپ لوگ الاسلام یتحدیٰ کا مطالعہ کیجئے۔ جس میں اسلام کے خلاف جدید شبہات کا کافی وشافی رد موجود ہے۔ صفحات ۲۲۶

ان کے علاوہ متعدد دوسری کتابیں تکمیل کے مرحلہ میں ہیں جو انشاء اللہ جلد شائع ہوں گی۔ مثلاً "صفحات" "تاریخ کا سبق"، "ملت کی تعمیر"، "اسلام دور جدید میں"، "سائنسی مضامین"، "مستقبل کی طرف" وغیرہ

مکتبہ الرسالہ۔ جمعیۃ بلڈنگ۔ قاسم جان اسٹریٹ۔ دہلی ۶

"الاسلام" کے بعد ادارۂ الرسالہ کی دوسری کتابی پیش کش

ظہور اسلام

از مولانا وحید الدین خاں

صفحات ۲۰۰ —— قیمت دس روپے

آفسیٹ کی اعلیٰ طباعت کے ساتھ

جدید اسلامی لٹریچر میں اپنی نوعیت کی پہلی کتاب

روانگی کا خرچ بذمہ ادارہ

مکتبہ الرسالہ جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی ۱۱۰۰۰۶

قرآن پہلی کتاب ہے جس نے انسانی تاریخ میں دور نثر کا آغاز کیا۔ علمی طرز فکر کی بنیاد رکھی اور سائنٹفک استدلال کو رائج کیا۔ موجودہ دور کا علمی انقلاب، قرآن ہی کے پیدا کردہ انقلاب کا نتیجہ ہے۔ مگر عجیب بات ہے کہ قرآن کے حاملین اس انقلاب کو سمجھنے میں سب سے پیچھے ہیں —— وہ ابھی تک شعر و شاعری کی فضا سے نکل نہ سکے۔ حتیٰ کہ ان کی نثر بھی خطابت اور شاعری کی ایک صورت ہوتی ہے۔ سائنٹفک استدلال میں ان کے پیچھے ہونے کا حال یہ ہے کہ ان کے علماء اب تک بھی سائنٹفک استدلال اور مغرب زدگی کو ہم معنی سمجھتے ہیں۔

مسلمانوں کی اس علمی پس ماندگی کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ دور جدید کے معیار فکر پر ابھی تک اسلام کا علمی اظہار نہ ہو سکا۔ ہر دور کا ایک اسلوب اور ایک علمی معیار ہوتا ہے اور ہر دور کے مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ اپنے دور کے فکری معیار پر خدا کے دین کا اعلان کریں۔ "ظہور اسلام" جدید اسلامی تاریخ کی پہلی کتاب ہے جس میں اسلام کو وقت کے معیار فکر پر پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ایجنسی کی شرائط

۱۔ کم از کم پانچ پرچوں پر ایجنسی دی جائے گی۔

۲۔ کمیشن پچیس فی صد۔

۳۔ پیکنگ اور روانگی کے اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوں گے۔

۴۔ مطلوبہ پرچے کمیشن وضع کر کے بذریعہ وی پی روانہ ہوں گے۔

۵۔ غیر فروخت شدہ پرچے واپس لے لئے جائیں گے۔

منیجر **الرسالہ** جمعیۃ بلڈنگ۔ قاسم جان اسٹریٹ۔ دہلی ۶

ہر قسم کی کتابیں

قرآن، دینیات اور دوسرے موضوعات پر

کسی بھی ادارہ کی چھپی ہوئی

ہم سے طلب کیجئے

محصول ڈاک بذمہ خریدار ——— روانگی بذریعہ وی پی

مکتبہ الرسالہ

JAMIAT BUILDING, QASIMJAN STREET, DELHI-110006 (INDIA)

Single Copy Rs 2.00

Regd. No. D (D) 532
Regd. R.N. No. 28822/78

May 1978

Al-Risala Monthly

JAMIAT BUILDING, QASIMJAN STREET, DELHI-110006 (INDIA)

مؤلف:
مولانا وحیدالدین خاں

صفحات ۲۴۰ — قیمت مجلد مع پلاسٹک کور بارہ روپے

قیمت مجلد بغیر پلاسٹک کور دس روپے

دین کی حقیقت، تعلیمات قرآن کی حکمتیں، سیرت رسول کا انقلابی سبق
موجودہ زمانہ میں اسلام کے مسائل، دین کا تجدید و احیاء
امت مسلمہ کی تعمیر، دعوت اسلامی کے جدید امکانات —

ان موضوعات کے گہرے مطالعہ کے لئے "الاسلام" پڑھئے۔
جدید سائنٹفک اسلوب میں، نہایت دلچسپ اور معلومات سے بھرپور۔

قارئین الرسالہ کے مسلسل اصرار پر قیمت میں غیر معمولی کمی
تاجروں اور ایجنٹوں کے لئے خصوصی کمیشن

کتاب کی روانگی کا خرچ ادارہ کے ذمہ ہوگا

الدار العلمیہ، جمعیۃ بلڈنگ، قاسم جان اسٹریٹ، دہلی-۶